عظمتِ مصطفیٰ ﷺ

ڈاکٹر اسرار احمد

تنظیمِ اسلامی

A-67 علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور۔ 54600
فون: 36293939,36316638,36366638 فیکس: 36271241
www.tanzeem.org

عنوانات

عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کے قابلِ ادراک پہلو	5
عظمتِ مصطفیٰ ﷺ بحیثیت داعیٔ انقلاب	7
غیر مسلموں کا اعتراف اور شہادت	7
انقلابِ نبویؐ کا دیگر انقلابات سے تقابل	13
دس برس کی محنت شاقہ کا حاصل	19
یومِ طائف۔ حیاتِ طیبہ کا شدید ترین دن	24
بیعت عقبہ اولیٰ و بیعت عقبہ ثانیہ	29
داخلی استحکام کی خاطر اقدامات	33
مستشرقین کی کوتاہ نظری	33
رسول اللہ ﷺ کی طرف سے چھاپہ مار مہموں کا آغاز	35
غزوۂ بدر: مسلح تصادم کا آغاز	37
انقلاب اسلامی کی توسیع وتصدیر کا مرحلہ	40
عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کا ظہور کامل ۔ کب اور کیسے؟	42

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحریک خلافت پاکستان کے تحت داعیٔ تحریک خلافت و بانیٔ تنظیم اسلامی
ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ تعالیٰ کا ایک فکر انگیز خطاب
بمقام: فورسیزنز ہال لاہور' یکم جولائی ۱۹۹۹ء

معزز حاضرین! آپ کو معلوم ہے میرا آج کا موضوع ''عظمتِ مصطفیٰ ﷺ'' ہے۔ اس موضوع پر سب سے پہلے مجھے یہ تمہیدی بات آپ کے گوش گزار کرنی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کی عظمت کے مختلف پہلو ہیں۔ ایک تو آپؐ کا مقام و مرتبہ اور آپؐ کی عظمت بحیثیت نبی ہے اور ایک آپؐ کی عظمت اور آپؐ کا مقامِ رفیع و بلند بحیثیت انسان ہے۔ پھر انسان کی حیثیت سے بھی ایک پہلو روحانیات کا ہے' یعنی آپ ﷺ کا مقام و مرتبہ روحانی اعتبار سے اور دوسرا پہلو عام انسانی معاملات کا ہے' جن میں سے انسان اپنی زندگی کے دوران لامحالہ گزرتا ہے اور مختلف حیثیتوں سے اس دنیا میں کام کرتا ہے۔ عظمت محمدیؐ کے یہ جو مختلف پہلو ہیں' ان میں بعض پہلوؤں کے اعتبار سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ آپ ﷺ کی عظمت کا بیان تو درکنار اس کا ادراک و شعور اور فہم بھی ہمارے لیے ناممکنات میں سے ہے۔ سادہ سی مثال ہے کہ ایک معالج' ڈاکٹر یا حکیم کا اپنے فن میں کیا مقام و مرتبہ ہے' ظاہر ہے اسے صرف کوئی ڈاکٹر' حکیم یا معالج ہی جان سکتا ہے۔ اسی طرح ایک انجینئر کا اپنے فن میں کیا مقام و مرتبہ ہے' ظاہر ہے اس سے کوئی انجینئر ہی واقف ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ایک نبی کی حیثیت سے نبی اکرم ﷺ کا کیا مقام و مرتبہ ہے؟ یہ صرف کسی نبی ہی کے لیے ممکن ہے کہ اس کا اندازہ کر سکے' کسی غیر نبی کے لیے یہ محالِ عقلی ہے۔ مزید برآں کسی انسان کا کسی ادارے یا فرم میں کیا مقام و مرتبہ ہے اس کا صحیح تعین وہی شخص کر سکتا ہے جو اس ادارے میں اس سے بالاتر ہو' اس لیے کہ نیچے والا تو اوپر کی طرف صرف دیکھے گا' اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اپنے سے بلند مقام کے حامل شخص کا اصل مقام و مرتبہ معین کر سکے۔ ظاہر بات ہے نبی اکرم ﷺ سے بالاتر مقام کسی نبی کا نہیں' لہٰذا کسی نبی کے لیے بھی یہ محالِ عقلی ہے کہ حضور ﷺ کے اصل مقام و مرتبہ کو سمجھ سکے' کجا یہ کہ کوئی عام انسان اور غیر نبی حضور ﷺ کے مقام

کا تعین کرے۔ اسی طرح روحانی اعتبار سے حضور ﷺ کا مقام کیا ہے؟ ظاہر بات ہے ہم جیسے لوگوں کے لیے اس کا ادراک و شعور ممکن نہیں۔

بعض اعتبارات سے خود حضور ﷺ نے اسے واضح کیا ہے کہ یہ تمہارے لیے ناممکن ہے کہ تم ان مقامات کو سمجھ سکو! مثال کے طور پر حضور ﷺ صومِ وصال رکھتے تھے۔ صومِ وصال یہ ہے کہ آج روزہ رکھا اور شام کو افطار نہیں کیا اور وہی روزہ رات سے گزر کر اگلے دن تک چلا' اور اگر اگلے دن شام کو افطار کیا گیا تو یہ دو دن کا صومِ وصال ہوا' اور اگر یہی روزہ تیسرے دن تک چلا تو وہ تین دن کا صومِ وصال ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ خود صومِ وصال رکھتے تھے لیکن آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کو یہ روزہ رکھنے سے روکے رکھا۔ اس پر کسی صحابیؓ نے سوال کر لیا تو آپؐ نے فرمایا: ((وَاَيُّكُمْ مِّثْلِيْ)) ''تم میں سے کون ہے جو میرے مانند ہو؟'' ((اِنِّيْ اَبِيْتُ يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ)) ''میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا ربّ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے''۔[1] ہمارے لیے کس طرح ممکن ہے کہ آپ ﷺ کی اس شب بسری کا تصور کر سکیں جو اللہ کے ہاں ہوتی تھی' اس کی نوعیت اور اس کی کیفیت کیا تھی! وہ کھلانا اور پلانا کس نوعیت کا تھا! معلوم ہوا کہ یہ چیز ہمارے دائرے سے خارج ہے۔ میں سمجھتا ہوں بڑے سے بڑے صوفی اور بڑے سے بڑے ولی اللہ کے لیے بھی ممکن نہیں ہے کہ حضور ﷺ کے روحانی مقام کا پورا پورا ادراک کر سکے۔

ان دونوں پہلوؤں سے جب ہماری عقلیں' ہمارا فہم اور شعور و ادراک عاجز ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اس کو بیان کرنے کی کوشش کرنا بھی بہت بڑی خطا ہے۔ یہ بڑی خطا کس اعتبار سے ہے؟ ایک سادہ سی مثال سے بات سمجھ میں آ جائے گی۔ کسی دیہاتی کی کوئی مشکل تھی جسے کس شہری بابو نے حل کر دیا' وہ شہری شخص ڈپٹی کمشنر تھا' لیکن اس دیہاتی نے اسے دعا دی کہ خدا تجھے پٹواری بنا دے۔ اس لیے کہ اس دیہاتی کے نزدیک تو سب سے بڑا عہدہ اور سب سے زیادہ صاحبِ اختیار ہستی پٹواری کی تھی' کیونکہ اس کی ذرا سی جنبش قلم سے زمین کسی اور کے نام ہو جاتی ہے اور اسی کے قلم کی جنبش سے مالیانہ معاف ہو جاتا ہے۔ اس کاشت کار اور دیہاتی سے متعلق سارے

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النہی عن الوصال فی الصوم وصحیح البخاری (قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ) کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة' باب ما یکرہ من التعمق والتنازع فی العلم والغلو فی الدین۔

اختیارات تو پٹواری کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اسے کیا معلوم کہ پٹواری سے لے کر ڈپٹی کمشنر تک کتنے عہدے درمیان میں ہیں اور وہ شخص کس بلند مقام پر فائز ہے جسے وہ دیہاتی پٹواری بننے کی دعا دے رہا ہے۔ چنانچہ اگر ہم حضور ﷺ کے مقاماتِ عالیہ کو بیان کرنے کی کوشش کریں گے تو شدید خطرہ ہے کہ ہم حضور ﷺ کی توہین کے مرتکب ہو جائیں۔ اس لیے کہ آپ ﷺ کے مقام کا کما حقہٗ بیان ممکن نہیں۔ اور جب کما حقہٗ بیان ممکن نہیں ہے تو ہم اپنے تصور کے مطابق بیان کریں گے، جو حضور ﷺ کے اصل مقام و مرتبہ سے بہت کمتر ہو گا۔ اور اسی کا نام توہین ہے۔ شیخ سعدیؒ نے نہایت سادگی کے ساتھ اس ساری بحث کو ایک رباعی میں سمو دیا ہے ؎

یَا صَاحِبَ الْجَمَالِ وَ یَا سَیِّدَ البَشر

مِن وَجْهِكَ الْمُنِیْر لَقَدْ نُوِّرَ القَمر

لَا یُمْكِنُ الثَّنَاءَ كَمَا كَانَ حَقَّهٗ

بعد از خدا بزرگ توئی قِصّہ مختصر

حضور ﷺ کی ثناء کا جتنا حق ہے وہ ہمارے لئے ممکن ہی نہیں ہے، لہٰذا ''لَا یُمْكِنُ الثَّنَاءَ كَمَا كَانَ حَقَّهٗ''، ہمیں بس یہ کہہ کر اس بات کے دامن میں پناہ لینی ہے کہ ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''۔ اللہ کے بعد آپ ہی کی ہستی عظیم ترین و بلند ترین ہے، ہم اسے کس طرح اور کیا بیان کریں؟ ہمارا تصور بلکہ ہمارا تخیل بھی سرنگوں ہے کہ وہ اس بلند و رفیع مقام کا ادراک اور شعور کر سکے۔ اسی بات کو نہایت خوبصورت انداز میں غالبؔ نے بایں طور پر بیان کیا ہے ؎

غالب ثنائے خواجہ بیزداں گزاشتیم

کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است!

کہ ہم نے آنحضور ﷺ کی ثنا و حمد کو خدا (یزداں) کے حوالے کر دیا ہے۔ ہم اس کی کوشش ہی نہیں کرتے، اس لیے کہ وہی ذاتِ پاک ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے اصل مقام و مرتبہ سے واقف ہے۔

عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کے قابل ادراک پہلو

میں نے دو اعتبارات سے آنحضور ﷺ کی عظمت اور آپؐ کے مقام و مرتبہ کو اپنے بیان کے دائرے سے بلند و بالا، اعلیٰ و ارفع اور اس اعتبار سے خارج قرار دیا ہے۔ البتہ ہماری سمجھ میں

حضور ﷺ کی عظمت کا جو پہلو آ سکتا ہے وہ ہے آپؐ کی عظمت بحیثیت ''انسان''۔ لیکن اگر اس کا بھی تجزیہ کریں گے تو بحیثیت انسان بھی آپؐ کی عظمت کے بے شمار پہلو ہیں۔ مثلاً حضور ﷺ کی حیثیت اور آپؐ کا مرتبہ و مقام بحیثیت ایک سپہ سالار کیا تھا۔ بڑے بڑے فوجی جرنیلوں سے پوچھئے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے مختلف غزوات میں جو جنگی حکمت عملی اختیار فرمائی اس میں آپؐ نے کس مہارت کا ثبوت دیا، حالانکہ جنگ بدر سے پہلے آپؐ نے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ جنگ بدر سے پہلے آپ ﷺ نے صرف چند مہمات میں شرکت کی، باضابطہ جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی، لیکن دنیا دنگ ہے کہ جنگ کی مہارت اور اس کی حکمت عملی کو مرتب و معین کرنے میں آپؐ نے کس درجے صلاحیت و قابلیت کا ثبوت دیا۔ پھر کسی سے صلح کرنی ہوتی تو صلح کی گفت و شنید (negotiation) میں آپؐ نے کس مہارت، کیسی واقفیت اور کیسی اہلیت کا مظاہرہ فرمایا۔ صلح حدیبیہ ہو، میثاقِ مدینہ ہو، یا اس سے بھی پہلے یثرب کے مختلف طبقات کو آپس میں جمع کرنے کے لیے آپؐ نے جو معاہدہ فرمایا، ان معاہدات کا مطالعہ کیجیے، عقلیں دنگ رہ جائیں گی۔

ایک قاضی القضاۃ کی حیثیت سے آپ ﷺ کا مقام کیا ہے؟ آج بھی اس دنیا میں ''قضا'' (Judiciary) کے سلسلے میں جس قدر اصول اختیار کیے گئے ہیں وہ سب کے سب محمد رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ ہیں، مثلاً کسی بھی مقدمے میں ایک فریق کی بات سن کر فیصلہ نہ کیا جائے جب تک کہ فریق ثانی کو بھی سن نہ لیا جائے۔ یہ اصول آپؐ کا بیان کردہ ہے۔ شک کا فائدہ ملزم کو دیا جائے گا، الزام لگانے والے کو نہیں۔ یہ فیصلہ محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے۔ اسی طرح یہ اصول آپ ﷺ ہی نے بنایا ہے کہ سو مجرم چھوٹ جائیں تو کوئی حرج نہیں لیکن کسی بے گناہ کو سزا نہ ملے۔ عالمی سطح پر پورا عدالتی نظام انہی اصولوں پر قائم ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے ہاں کرپشن نے بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ ہماری خیانتیں، بدعنوانیاں، جانبداریاں، ہمارا بک جانا اور سیاسی لوگوں کا آلۂ کار بن جانا وغیرہ، یہ چیزیں ہیں جنہوں نے عدلیہ کا بیڑہ غرق کیا ہوا ہے، لیکن جہاں تک اصولوں کا تعلق ہے یہ اصول تو محمد عربی ﷺ کے عطا کردہ ہیں۔

اس سے ذرا نیچے اتریئے۔ حضورؐ کا بحیثیت باپ کردار کیا تھا؟ یہ حضرت فاطمہؓ سے پوچھئے۔ حضورؐ کا بحیثیت شوہر کردار کیا تھا اور آپؐ کی کیا عظمت تھی؟ یہ حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہن سے پوچھئے۔ پھر یہ کہ ایک داماد ہونے کے اعتبار سے آپؐ کا کیا کردار تھا؟ یہ

حضرت عمر وابوبکرؓ سے پوچھئے۔ گویا کہ جتنے انسانی علائق ہو سکتے ہیں ان کے اعتبار سے آپؐ کی شخصیت کی عظمت اور کردار کی بلندی ہماری سمجھ میں آسکتی ہے۔

عظمتِ مصطفیٰ ﷺ بحیثیتِ داعیٔ انقلاب

اسی طرح ایک داعی کی حیثیت سے آپؐ کا کیا مقام ہے؟ ایک مربی کی حیثیت سے آپؐ کا کیا مقام ہے؟ یہ وہ چیزیں ہیں جو ہماری سمجھ میں آسکتی ہیں اور ہم ان کا کچھ نہ کچھ ادراک و شعور کر سکتے ہیں۔ لیکن ان تمام حیثیتوں یعنی داعی، مربی، مزکی کو میں ایک لفظ میں جمع کرنا چاہتا ہوں، یعنی ایک انقلاب کے داعی اور انقلابِ عظیم کے برپا کرنے والی کی حیثیت سے آپؐ کا مقام کیا ہے؟۔ گویا کہ ہم جن پہلوؤں سے حضور ﷺ کی عظمت کو سمجھ سکتے ہیں ان میں سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپؐ نے جو تبدیلی برپا کی یا اصطلاحاً جو عظیم انقلاب برپا کیا، اس انقلاب کا مطالعہ کیا جائے، اس کا حاصل اور اس کے نتائج مرتب کئے جائیں، اس کے لئے جو جدوجہد ہوئی اس کے بارے میں غور کیا جائے تو واقعتاً حضور ﷺ کی اصل عظمت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ یہ ہے آپؐ کی عظمت کا وہ پہلو جس کا اقرار پوری دنیا نے کیا اور جس کی گواہی پوری دنیا نے دی۔

غیر مسلموں کا اعتراف اور شہادت

واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی اس اعتبار سے نمایاں ترین صدی ہے کہ سابقہ صدیوں کے دوران حضور ﷺ کی ذاتِ مبارک سے جو تعصب غیر مسلموں کو تھا وہ رفتہ رفتہ اس صدی کے دوران ختم ہوا ہے اور اس صدی کے دوران آپؐ کی عظمت کا اس پہلو سے اعتراف اور اقرار تدریجاً پوری دنیا میں ہوا ہے۔ اس صدی کے بالکل آغاز میں اسی شہر لاہور میں ایم این رائے نے ۱۹۲۰ء میں ''بریڈلا ہال'' میں (جواب شاید کھنڈرات کی صورت اختیار کر گیا ہو گا یا وہاں کوئی اور چیز تعمیر ہو چکی ہو گی) ایک لیکچر دیا تھا جس کا موضوع "The Historical Role of Islam" تھا۔ یہ کتاب اب بھی ہندوستان میں طبع ہوتی ہے، جسے بمبئی کا ایک ناشر شائع کرتا ہے، میں نے حیدر آباد دکن میں اس کا نسخہ دیکھا ہے، لیکن پاکستان میں کہیں دستیاب نہیں ہے۔ ایم این رائے کون تھا؟ یہ ''کمیونسٹ انٹرنیشنل'' کا ممبر تھا۔ روس میں ۱۹۱۷ء میں اشتراکی انقلاب آیا اور اس کے

بعد پوری دنیا میں اس کا بڑا چرچا ہوا۔ اس کے بعد عالمی سطح پر کمیونزم کی جو تنظیم قائم ہوئی وہ ''کمیونسٹ انٹرنیشنل'' کہلاتی تھی۔ دنیا کے چوٹی کے انقلابی لوگ اس کے ممبر تھے۔ ایم این رائے ہندوستان کی جانب سے اس کا رکن تھا جو کہ بہت بڑا انقلابی تھا، لیکن وہ "The Historical Role of Islam" میں صاف صاف کہتا ہے اور بڑی تفصیل سے کہتا ہے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ تھا جو محمد عربی (ﷺ) نے برپا کیا تھا۔ حضور ﷺ کے جانشینوں اور جاں نثاروں نے جس سرعت کے ساتھ فتوحات حاصل کیں اور عراق، شام، ایران، مصر جس تیزی کے ساتھ فتح کئے، اگرچہ اس تیزی کے ساتھ تاریخ انسانی میں فتوحات پہلے بھی ہوئی ہیں، ریکارڈ پر ہے کہ سکندرِ اعظم مقدونیہ سے چلا تھا اور دریائے بیاس تک پہنچا اور جس تیزی کے ساتھ علاقے فتح کرتے ہوئے آیا وہ اپنی جگہ بہت بڑی مثال ہے۔ وہ تو مغرب سے مشرق کی طرف آیا تھا جبکہ اٹیلا مشرق سے مغرب کی طرف گیا تھا۔ چین کے شمال میں صحرائے گوبی سے نکل کر وہ ڈینوب کی وادی تک جا پہنچا تھا۔ لیکن ایم این رائے کہتا ہے کہ ان فاتحین کی فتوحات محض ہوسِ ملک گیری کا شاخسانہ تھیں۔ اس نے انہیں "brute military campaigns" قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے نتیجے میں کوئی نئی تہذیب یا کوئی نیا تمدن وجود میں نہیں آیا، دنیا میں کوئی روشنی نہیں پھیلی، کوئی علم کا فروغ نہیں ہوا۔ جبکہ محمد عربی ﷺ اور آپؐ کے جانشینوں کے ذریعے سے شرقاً غرباً جو فتوحات بڑی تیزی کے ساتھ ہوئیں ان کے نتیجے میں ایک نیا تمدن، ایک نئی تہذیب، علم کی روشنی اور انسانی اقدار کا فروغ وجود میں آیا۔ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جو ہر طرح کی زیادتیوں سے پاک تھا۔ اس میں سیاسی جبر نہیں تھا، اس میں معاشی استحصال نہیں تھا، اس میں کوئی سماجی فرق و تفاوت نہیں تھا جیسے کہ علامہ اقبال نے محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہا ہے ؎

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

دنیا میں اور بھی بڑے بڑے لوگ رہے ہیں جو سالہا سال تک پہاڑوں کی غاروں کے اندر تپسیائیں کرتے رہے ہیں، لیکن محمد عربی ﷺ نے غارِ حرا میں چند روز کے لیے جو خلوت گزینی اختیار کی تھی وہ اس قدر productive اور نتیجہ خیز تھی کہ اس سے ایک نئی قوم، نیا تمدن، نیا آئین اور حکومت وجود میں آ گئی ہے۔ یہ ہے آنحضور ﷺ کی وہ عظمت کہ جس کا اظہار ایم این رائے نے

اس صدی کے رُبع اوّل کے آخری سالوں میں کیا، جو مسلمان نہیں، ہندو کمیونسٹ تھا۔

دوسری طرف اس صدی کے رُبع آخر کے ابتدائی سالوں میں امریکہ میں ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کی کتاب ''The Hundred'' ۱۹۸۰ء میں منظرِ عام پر آئی، جس میں اس نے پوری معلوم تاریخ انسانی کا جائزہ لیا ہے کہ تاریخ کے سفر کے دوران کن کن شخصیات نے اس تاریخ کے دھارے کا رخ موڑا ہے۔ اس نے ایسے سو افراد کو چن کر اُن پر کتاب لکھی ہے اور ان کے اندر بھی درجہ بندی (Gradation) کی ہے کہ کس شخصیت نے سب سے زیادہ تاریخ کے دھارے کو متاثر کیا ہے اور سب سے زیادہ گھمبیر انداز میں اسے موڑا ہے۔ چنانچہ اس نے حضرت محمد ﷺ کو اس درجہ بندی میں سب سے اوپر رکھا ہے۔ اس کتاب کا مصنف تاحال عیسائی ہے اور ابھی زندہ ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تیسرے نمبر پر لایا ہے جبکہ نیوٹن کو دوسرے نمبر پر لایا ہے۔ نیوٹن کی فزکس نے جس طرح تاریخ انسانی کو متاثر کیا ہے اس میں واقعتاً کوئی شک نہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے پورے explosion کا نقطۂ آغاز نیوٹن ہے۔ شخصیات کے انتخاب اور درجہ بندی میں مؤلف نے کوئی مذہبی پہلو مدنظر نہیں رکھا، نہ ہی اپنے عقائد کو پیشِ نظر رکھا ہے، بلکہ اس کا موضوع ہی یہ ہے کہ تاریخ انسانی کے دھارے کے رُخ کو موڑنے والی کون کون سی شخصیات ہیں۔ ان شخصیات میں نمبر ایک پر محمد رسول اللہ ﷺ، نمبر دو پر نیوٹن اور نمبر تین پر حضرت مسیح علیہ السلام ہیں۔ مسلمانوں میں اس نے ایک اور شخصیت کو ان سو (۱۰۰) کی فہرست میں شمار کیا ہے اور وہ ہیں ٹھیک پچاسویں نمبر پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، بلکہ اس نے خود سوال اٹھایا ہے کہ میں ایک عیسائی ہوں اور عیسائی ہوتے ہوئے محمد (ﷺ) کو میں نمبر ایک پر کس اعتبار سے رکھ رہا ہوں؟ اس کا جواب وہ خود دیتا ہے:

"This is because he is the only person supremely successful in both the religious and the secular fields."

یہ بہت گھمبیر اور معانی خیز جملہ ہے۔ لیکن اسے سمجھنے کے لیے پہلے یہ سمجھنا ہوگا کہ اس وقت کی عالمی فضا میں انسانی زندگی کو دو جداگانہ گوشوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک مذہب کا گوشہ ہے، اس کا تعلق اجتماعیت سے نہیں ہے، بلکہ صرف افراد سے ہے کہ ہر فرد کو اجازت ہے کہ جس کو چاہے مانے،

جس پر چاہے یقین رکھے، ایک خدا کو مانے، سو کو مانے، کسی کو نہ مانے، فرد کو اس کی پوری آزادی حاصل ہے، جسے چاہے پوجے، پتھروں کو پوجے، درختوں کو پوجے، ستاروں کو پوجے، چاند کو پوجے یہاں تک کہ اعضاءِ تناسل کو پوجے، ٹھیک ہے اسے اجازت ہے۔ لیکن یہ معاملہ انفرادی ہے۔ اس میں مراسمِ عبودیت (rituals) کے علاوہ کچھ سماجی رسومات (Social customs) کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً بچے کی پیدائش ہوئی ہے تو اس کی خوشی کیسے منائیں، کوئی فوت ہو گیا ہے تو اس کی میت کو کیسے ٹھکانے لگائیں؟ جلائیں، دفن کریں یا کہیں رکھ دیں کہ چیل اور کوے کھا جائیں، وغیرہ۔ اس کی بھی ہر شخص کو آزادی ہے۔ لیکن یہ تینوں چیزیں عقیدہ (dogma)، مراسمِ عبودیت (rituals) اور سماجی رسوم (Social Customs) انفرادی زندگی سے متعلق ہیں۔ دوسری طرف معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کا تعلق زندگی کے سیکولر میدان سے سمجھا جاتا ہے جس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس پر تو لوگ خود غور کریں گے، ان کے نمائندے بیٹھیں گے اور طے کریں گے، اور وہ بیٹھ کر اکثریت سے جو طے کر لیں وہی سماجی اقدار فروغ پا جائیں گی۔ جو بھی اکثریت سے طے کر لیں کہ یہ سماجی برائیاں ہیں، ان کا وہ قلع قمع کریں گے۔ اگر وہ شراب کی اجازت دینا چاہیں تو دیں اور اگر شراب پر پابندی لگانا چاہیں تو پابندی لگائیں۔ زنا کو قابلِ دست اندازیٔ پولیس جرم قرار دینا چاہیں گے تو دے دیں گے، اگر زنا بالرضا ہے تو اس میں کوئی جرم والی بات ہی نہیں۔ اگر اس میں کسی شوہر کا حق مارا گیا ہو تو وہ جائے اور سول مقدمہ دائر کر دے۔ اسی طرح اگر چاہیں گے تو دو مَردوں کی شادی کو بھی قانونی حیثیت دے دیں گے کہ ٹھیک ہے ایک شخص ملکی قانون میں شوہر کی حیثیت اور دوسرا شخص بیوی کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا سماجی، معاشی یا سیاسی معاملات میں سے کسی کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ secular field of life ہے۔

اب نوٹ کیجیے کہ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کا یہ بات کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں جتنی عظیم شخصیات ہیں وہ اگر ایک پہلو سے بلندی کی حامل ہیں تو دوسری طرف ان کا سرے سے کوئی مقام نہیں، ممکن ہے وہ کسی معاملے میں صفر ہوں، بلکہ شاید ان کے لیے کوئی minus value معین کی جائے۔ مثلاً مشرق میں گوتم بدھ اور مغرب میں حضرت مسیح علیہ السلام، دونوں کی مذہب اور روحانیت کے میدان میں اور پیروکاروں کی تعداد کے اعتبار سے کتنی عظمت ہے، لیکن ریاست،

سیاست اور معاملاتِ ملکی میں ان کا کوئی مقام اور کوئی حصہ نہیں' اس میں وہ دونوں صفر تھے۔ اسی طرح دوسری طرف اٹیلا ہو' سکندرِ اعظم ہو یا اور بہت بڑے بڑے حکمران جو دنیا میں گزرے ہیں' یہ سیکولر میدان میں تو بہت بلندی پر ہیں لیکن مذہبی میدان میں اس درجے پستی کا شکار ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ صفر سے بھی کام نہ چلے بلکہ منفی (minus) ویلیو لانی پڑے۔ سکندرِ اعظم کے لیے لازماً کوئی نہ کوئی منفی (minus) ویلیو لانی پڑے گی۔ مائیکل ہارٹ کا کہنا یہ ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں صرف اور صرف ایک ہی انسان (The only Person) ہے جو دونوں میدانوں میں انتہائی بلندی پر ہے۔

He is the only person supremely successful in both the religious and secular field.

یعنی اور کوئی ہے ہی نہیں' اس کا تقابل کیا ہوگا؟

یہ میں نے آپ کو صدی کے اُس سرے اور اِس سرے سے دو مثالیں دی ہیں۔ اب ذرا صدی کے درمیان سے بھی مثال دے دوں۔ H.G.Wells برطانوی سائنٹیفک فکشن رائٹر کی حیثیت سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اس نے بڑے اچھے اچھے ناول اور کہانیاں لکھیں جن میں اس نے یہ reflect کیا کہ سائنس کدھر جا رہی ہے۔ سائنس کی جو ایجادات اور جو اکتشافات ابھی ہونے تھے ان کو پہلے سے visualize کر کے ان پر اس نے اپنی کہانیوں اور ناول کے بنیادی خاکے اور پلاٹس کو مبنی کیا۔ لہٰذا وہ Scientific fiction کے اعتبار سے مشہور ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے تاریخِ عالم پر دو کتابیں "Short History of the World" اور "Concise History of the World" لکھیں۔ مؤخر الذکر کتاب زیادہ ضخیم ہے اور اس میں آنحضور ﷺ پر جو باب ہے اس میں اس نے اپنے (میں اپنے دل پر جبر کر کے آپ کو بتا رہا ہوں کہ) ابتداء میں حضور ﷺ کی ذاتی' نجی و خانگی زندگی پر نہایت رکیک حملے کئے ہیں۔ یوں سمجھئے جیسے دو ملعون نام' انگلینڈ میں سلمان رشدی اور بنگلہ دیش میں تسلیمہ نسرین' نے آنحضور ﷺ کی شخصیت پر جس قدر چھینٹے اڑائی ہیں اسی طرح کے چھینٹے H.G.Wells نے حضور ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر خصوصاً خانگی زندگی کے حوالے سے اڑائی ہیں' لیکن جب وہ اس باب کے اخیر میں پہنچتا ہے اور خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر کرتا ہے تو آنحضور ﷺ کی عظمت کے سامنے گھٹنے ٹیک کر خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ آپؐ کے الفاظ نقل کرتا ہے:

((لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی اَعْجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا اَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی))[۱]

((اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ بَنُوْ آدَمَ وَآدَمُ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ))[۲]

''لوگو! کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں! اسی طرح کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں! کسی سرخ و سفید رنگ والے شخص کو کسی سیاہ فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں اور اسی طرح کسی سیاہ فام کو کسی سفید فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں! فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدمؑ کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے''۔

ان جملوں کا وہ باقاعدہ حوالہ دیتا ہے اور پھر لکھتا ہے:

"Although the sermons of human freedom, fraternity and equality were said before. We find a lot of these sermonsin in Jesus of Nazarath, but it must be admitted that it was Mohammad who for the first time in history established a society based on these principles."

''اگرچہ انسانی حریت' مساوات اور اخوت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کے بارے میں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت سے مواعظ حسنہ ملتے ہیں' لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ صرف محمد عربی (ﷺ) ہی تھے جنہوں نے تاریخِ انسانی میں پہلی مرتبہ بالفعل ایک باضابطہ معاشرہ انہی اصولوں پر قائم کر کے دکھایا''۔

آپ اندازہ کیجیے کہ یہ دشمن کا خراج تحسین ہے جو کہ معتقد نہیں ہے۔ میں نے اسی لیے جبر کر کے بتایا ہے کہ وہ شخص اتنی بڑی حماقت کا مظاہرہ کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ' نقل کفر کفر نباشد) محمد جیسے گھٹیا آدمی کے گرد خدیجہ' ابوبکر' عثمان اور عمر جیسے عظیم انسان کیسے جمع ہو گئے''۔ حالانکہ اس احمق سے کوئی پوچھے کہ اس سوال کا جواب تو تمہیں دینا چاہیے۔ درخت تو اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے۔ تم مخمصے میں ہو جبکہ تمہیں حضرت خدیجہ' ابوبکر' عمر' عثمان وعلی رضی اللہ عنہم کی عظمت کا اعتراف واقرار ہے پھر بھی تمہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی عظیم شخصیتیں محمد

(۱) مسند احمد' ح ۲۲۹۷۸

(۲) سنن الترمذی' کتاب المناقب عن رسول اللہ ﷺ' باب فی فضل الشام والیمن۔

(ﷺ) کے گرد کیسے جمع ہو گئیں۔ آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ان لوگوں کے دل و دماغ کے اندر ذاتی طور پر کتنا عناد، بغض اور دشمنی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اس حقیقت کے اعلان و اعتراف پر مجبور ہے کہ محمد عربی ﷺ کے ہاں انسانی حریت و اخوت و مساوات کے صرف وعظ ہی نہیں ملتے بلکہ آپؐ نے ان اصولوں پر بالفعل ایک معاشرہ قائم کر کے دکھایا۔ سچ ہے کہ ’’اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ ‘‘ یعنی اصل فضیلت تو وہ ہے جس کا اعتراف و اقرار دشمن بھی کریں۔ گویا جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ ظاہر بات ہے جو دوست ہے، عقیدت مند ہے اور محبت کرنے والا ہے، اس کی نگاہ تو محبوب کی کسی خامی کو دیکھ ہی نہیں سکتی، اس کی طرف سے تو گویا وہ نابینا ہو جاتی ہے جبکہ دشمن میں کوئی خیر اور خوبی نظر نہیں آتی، لیکن اگر کوئی دشمن کسی کی فضیلت کا اعتراف کرے تو اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہاں البتہ ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ آنحضور ﷺ کی مدح میں H.G.Wells نے اپنی کتاب میں یہ جملے جو لکھ دیئے تھے انہیں کتاب کے موجودہ مرتبین اور نئے ایڈیٹرز نے حذف کر دیا ہے۔ یہ جملے ان کے حلق سے نیچے نہیں اتر پائے۔ H.G.Wells کو تو فوت ہوئے بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ اب "Concise Hisotry of the World" کا جو نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے اس میں وہ جملے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ یہ وہ کڑوی گولی تھی جو ان کے حلق سے نیچے نہیں اُتر پائی۔ لیکن آپ کو پنجاب پبلک لائبریری یا کسی اور پرانی لائبریری سے یہ پرانے نسخے مل جائیں گے جس میں مذکورہ بالا الفاظ موجود ہیں۔

انقلابِ نبویؐ کا دیگر انقلابات سے تقابل

محمد رسول اللہ ﷺ کی اصل عظمت جس کو ہم بحیثیت انسان سمجھ سکتے ہیں، جس کا لوہا آج پوری دنیا مان رہی ہے اور جس کا انکشاف پورے عالم انسانی پر ہو چکا ہے، وہ یہ ہے کہ آپ نے ایک عظیم ترین، گھمبیر ترین، جامع ترین اور ہمہ گیر ترین انقلاب برپا کیا اور یہ انقلاب کم از کم وقت میں برپا کیا گیا۔ اس سے بھی زیادہ نمایاں بات یہ ہے کہ اس انقلابی جدوجہد کی ابتداء سے لے کر اختتام تک جتنے مراحل بھی آئے آنحضور ﷺ نے اس کے ہر ہر مرحلے پر قیادت کی ذمہ داری خود ادا فرمائی۔ اس اعتبار سے تقابل کر لیجیے کہ تاریخ انسانی کے دو انقلابات بہت مشہور ہیں۔ انقلابِ فرانس یقیناً ایک بہت بڑا انقلاب تھا، دنیا سے بادشاہت کے خاتمے اور جمہوریت کے دور کا آغاز اسی انقلابِ فرانس سے ہوا، جو سوا دو سو برس قبل کی بات ہے۔ انقلابِ روس یعنی بالشویک انقلاب

بھی یقیناً ایک عظیم انقلاب تھا، جو ۱۹۱۷ء میں آیا۔ اگرچہ ستر برس کے اندر اندر اس انقلاب کی موت واقع ہو گئی لیکن کھنڈر بتا رہے ہیں کہ عمارت عظیم تھی۔ وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ وجود میں آیا تھا اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ پھیلتے ہوئے روس سے لاطینی امریکہ تک جا پہنچا۔ کتنی عظیم توسیع بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ہوئی ہے۔ لیکن ان دونوں انقلابات کا جائزہ لیں تو یہ حقائق سامنے آتے ہیں:

(۱) دونوں جزوی انقلاب ہیں۔ انقلابِ فرانس میں صرف سیاسی ڈھانچہ بدلا، باقی عقائد، رسومات، سماجی نظام، سماجی اقدار، معاشی نظام اور تمام معاشی ادارے اسی طرح قائم رہے۔ سیاسی نظام کے سوا باقی زندگی جوں کی توں رہی۔ دوسری طرف بالشویک انقلاب کے ذریعے معاشی ڈھانچہ بدل گیا، اس میں انفرادی ملکیت ختم ہو گئی، تمام وسائل پیداوار قومی ملکیت میں آ گئے لیکن مکمل تبدیلی نہیں آئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہاں جیسے پہلے کرسچین موجود تھے اسی طرح بعد میں بھی رہے، جو عقائد پہلے تھے وہی بعد میں رہے۔ سماجی اقدار بھی وہی رہیں۔ سارا نقشہ جوں کا توں رہا، بس معاشی انقلاب آ گیا۔ اس کو پس منظر میں رکھ کر دیکھئے محمد عربی ﷺ کا لایا ہوا انقلاب کس قدر جامع اور گھمبیر ترین تھا۔ یہاں آپ خوردبین لگا کر دیکھ لیجیے، کیا کوئی ایسی چیز ہے جو سابقہ حالت میں باقی رہ گئی ہو؟ جواب نفی میں ملے گا۔ عقائد و نظریات بدل گئے، شخصیتیں بدل گئیں، اخلاق بدل گئے، ان کے شب و روز کے انداز بدل گئے، صبح و شام بدل گئے، نشست و برخاست کے انداز بدل گئے، پھر یہ کہ سماجی نظام، سیاسی نظام اور معاشی نظام بدل گیا۔ وہ قوم جس میں پڑھے لکھے لوگ بمشکل انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے وہ علوم کے موجد ہو گئے، دنیا کے استاد بن گئے۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے علوم ہند و یونان سے لیے اور انہیں ترقی دے کر پورے عالم میں پھیلا دیا۔ آپؐ کا انقلاب ہمہ گیر ترین، جامع ترین اور عظیم ترین انقلاب تھا۔ انقلابِ محمدیؐ کے مقابلے میں انقلابِ روس اور انقلابِ فرانس کی کیا حیثیت ہے؟ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک!

(۲) فرانس اور روس کے انقلابات بلکہ دنیا کے دوسرے تمام انقلابات کے اندر یہ چیز قدر مشترک ہے کہ فکر دینے والے اور دعوت کا آغاز کرنے والے کچھ اور لوگ تھے، لیکن وہ صرف قلم کار اور مصنفین تھے، وہ مَردِ میدان نہیں تھے، چنانچہ وہ انقلاب کی عملی جدوجہد میں سامنے نہیں آئے۔ نہ انہوں نے خود آگے بڑھ کر کوئی انقلابی جماعت بنائی اور نہ آگے بڑھ کر انقلابی جدوجہد

کی قیادت کی۔ وہ تو صرف people of the desk تھے۔ انقلاب کچھ اور لوگوں کے زیرِ قیادت وزیرِ راہنمائی وجود میں آیا‘ کیونکہ انقلابی فکر فراہم کرنے والے میدان کے آدمی تھے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابِ فرانس بڑا خونی انقلاب کہلاتا ہے‘ کیونکہ قیادت کوئی نہیں تھی‘ وہ تو ایک فکر تھا جو پھیل گیا اور اس نے لوگوں میں جوش وخروش پیدا کر دیا‘ اور پھر اچانک وہ لاوا پھٹ پڑا۔ چونکہ کوئی تنظیم نہیں تھی اور کوئی قیادت نہیں تھی لہٰذا انتہائی خونی انقلاب آیا۔ روس میں بالشویک انقلاب کی بنیاد ’’Das Capital‘‘ نامی کتاب بنی‘ جو کارل مارکس اور اینجلز نے مشترکہ طور پر لکھی۔ اندازہ کیجیے کہ یہ کتاب کتنے ٹھوس دلائل پر مبنی ہوگی کہ اس نے کس طرح انسانی ذہن کو اپنی گرفت میں لیا اور کس طرح ساری تعبیرات کو بدل کر رکھ دیا۔ اس کتاب میں پوری حیاتِ انسانی کی خالصتاً مادی تعبیر کی گئی ہے اور مذہب وروحانیت کی بالکل نفی کی گئی ہے‘ لیکن اس کتاب کے دلائل نے لوگوں اس طرح اپنی گرفت میں لے کر انہیں متحرک کیا کہ لوگ جانیں تک دینے کو تیار ہو گئے اور انقلاب برپا کر دیا۔ اقبال نے یونہی نہیں کہا کہ ع

’’نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب!‘‘

تو واقعتاً اس ایک کتاب نے یہ بالشویک انقلاب برپا کیا ہے‘ جس کے مصنف مارکس اور اینجلز تھے۔ ان دونوں نے اپنی یہ کتاب جرمنی اور لندن میں بیٹھ کر لکھی‘ لیکن جرمنی اور لندن میں کوئی انقلاب واقع نہیں ہوا۔ پھر یہ دونوں مصنف اپنی زندگی میں اپنی قیادت اور سرکردگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب برپا نہیں کر سکے۔ انقلاب تو وہاں سے ہزاروں میل دور بالشویک پارٹی کے ذریعے روس میں آیا۔ اور جس طرح انقلابِ ایران سے پہلے خمینی صاحب فرانس میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے اور انہوں نے عین وقت پر آ کر ایران میں ہونے والے ہنگاموں کی قیادت سنبھال لی‘ اسی طرح عین وقت پر لینن نے آ کر اس تحریک کو ہائی جیک کیا اور انقلاب برپا کر دیا۔

اس تناظر میں دیکھئے کہ محمد عربی ﷺ نے ایک فردِ واحد کی حیثیت سے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ آپ ﷺ ہی فکر دینے والے تھے‘ آپؐ ہی دعوت دینے والے تھے‘ آپؐ ہی مکے کی گلیوں میں گھوم پھر کر تبلیغ کر رہے تھے: ((یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا)) [1] ’’اے لوگو! کہہ دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں‘ کوئی الٰہ نہیں‘ کامیاب ہو جاؤ گے۔‘‘ آپؐ ہی ہیں جو کبھی

(۱) مسند احمد‘ ح ۱۵۵۹۳ و ۱۶۱۶۸ و ۱۸۵۲۵ و ۲۲۶۴۰ و ۲۲۶۸۱

اپنے رشتہ داروں کو جمع کر کے ان کے سامنے دعوت پیش کر رہے ہیں اور کبھی کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے پکارتے ہوئے لوگوں کو جمع کرتے ہیں اور دعوت پیش کرتے ہیں۔ آپؐ ایک فردِ واحد اور داعی کی حیثیت سے سامنے آئے اور کل بائیس برس میں پورے جزیرہ نمائے عرب میں انقلاب کی تکمیل کر دی اور ہر ہر مرحلے پر اس کی قیادت خود فرمائی۔ وہی گلیوں میں تبلیغ کرنے والے غزوۂ بدر میں کمانڈر ہیں‘ غزوۂ احد میں وہی سپہ سالار ہیں۔ جیسے کہ میں نے مائیکل ہارٹ کی کتاب کا حوالہ دیا ہے‘ یہ نقشہ دنیا نے کبھی دیکھا ہی نہیں‘ اس کی کوئی نظیر یا مثال ہی نہیں۔ کیونکہ گلی کوچوں میں تبلیغ کرنے والے تو یہی کام کرتے رہ جاتے ہیں‘ مربی اور مزکی کا اپنا ایک دائرہ ہوتا ہے‘ جو ان کے پاس چل کر آئیں‘ ان کی خانقاہ میں طالب بن کر آئیں تو ان کا کچھ تزکیہ کر دیں گے‘ کچھ اصلاح ہو جائے گی۔ لیکن یہ منظر چشمِ فلک نے ایک ہی بار دیکھا ہے کہ ایک فردِ واحد فکر دے رہا ہے‘ وہی دعوت دے رہا ہے اور اس مرحلے پر بظاہر کیسی کیسی ناکامیاں سامنے آتی ہیں۔

جب پہلی مرتبہ حکم ہوا: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْـرَتَكَ الْاَقْـرَبِيْنَ ۝۲۱۴﴾ (الشعراء) ’’(اے نبیؐ!) اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کیجیے‘‘ تو آپ ﷺ نے حضرت علی ؓ کو جو کہ آپؐ کے زیرِ کفالت اور زیرِ تربیت تھے اور گھریلو سامان لانا اور اس کا بندوبست کرنا انہی کے ذمہ تھا‘ حکم دیا کہ ایک دعوتِ طعام کا انتظام کرو اور تمام بنو ہاشم کو بلاؤ۔ چنانچہ دعوت کا اہتمام ہوا اور تمام بنی ہاشم جمع ہو گئے۔ جب لوگوں نے کھانا کھا لیا تو اب حضور ﷺ بات کرنے کے لیے کھڑے ہوئے‘ لیکن کچھ لوگوں نے ہوٹنگ کی‘ کچھ نے فقرے چست کیے اور کچھ نے شور مچایا اور سارا مجمع چلا گیا۔ حضور ﷺ اپنی بات کہہ بھی نہ سکے۔ یہ نہ سمجھئے کہ ادھر آپؐ نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور ادھر کامیابیوں نے قدم چومنے شروع کر دیئے ہوں۔ آنحضور ﷺ نے انقلابی جدوجہد کے اس اہم نکتے کو نوٹ کر لیجیے کہ یہ جدوجہد خالص انسانی سطح پر ہوئی اور اس میں وہ سارے مراحل آئے جو کسی بھی انسانی جدوجہد میں آتے ہیں۔ چنانچہ ابتدائی طور پر ناکامیاں اور مایوسیاں بھی آئیں‘ بے پناہ محنت اور مشقت کا نتیجہ مرئی طور پر صفر دکھائی دیتا تھا۔

لیکن حضور ﷺ نے چند دن کا وقفہ دے کر حضرت علی ؓ سے دوبارہ فرمایا کہ پھر دعوت کا اہتمام کرو۔ میں کہا کرتا ہوں کہ شاید لوگوں کو شرم آ گئی ہو‘ آخر اتنی شرافت تو ان لوگوں کے اندر بھی تھی کہ دو دفعہ ان کے دسترخوان پر کھانا کھا لیا ہے‘ اب آخر ان کا حق بن گیا ہے کہ ان کی بات سن

لیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے دعوت پیش کی۔ آپؐ نے نہایت عظیم، مختصر مگر جامع اور نہایت مؤثر خطبہ پیش کیا۔ بہر حال لوگوں نے سن لیا اور پورے مجمع کو سانپ سونگھ گیا کہ کوئی نہیں بولا۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ اگرچہ میں سب سے کم عمر ہوں، اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں، اگرچہ میری انکھیں دکھتی ہیں، لیکن میں آپؐ کا ساتھ دوں گا۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آشوبِ چشم کا عارضہ بچپن ہی سے تھا، معلوم ہوتا ہے کہ ککروں کا مرض تھا جو بچپن ہی سے شروع ہوتا ہے۔ مختلف جنگوں کے مواقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھ دکھتی تو حضور ﷺ اپنا لعابِ دہن لگا دیتے جس سے انہیں کچھ سکون حاصل ہوتا اور پھر وہ جنگ میں حصہ لے سکتے۔) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بات سن کر پورا مجمع کھلکھلا کر ہنس پڑا کہ یہ دنیا کی تقدیر بدلنے چلے ہیں اور یہ ہیں ان کے ساتھی! ذرا غور کیجیے کہ یہاں سے محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد کا آغاز ہو رہا ہے۔

اس کے بعد حکم آتا ہے کہ ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ ”(اے نبی!) ڈنکے کی چوٹ کہیے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے“۔ شروع میں تین سال تک حضور اکرم ﷺ نے انفرادی طور پر ذاتی رابطے کے ذریعے دعوت کو پھیلایا۔ تاہم یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ حضور ﷺ کی ذاتی زندگی میں خفیہ دعوت کا کوئی دور نہیں آیا، آپؐ نے کوئی بات خفیہ طور پر نہیں کی، آپؐ کی کوئی زیرِ زمین سرگرمیاں نہیں تھیں۔ البتہ low profile میں ذاتی رابطوں کے ذریعے یہ بات پھیلائی، لیکن اب حکم آ گیا: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ یعنی ”(اے محمد!) اب ڈنکے کی چوٹ کہو جس کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے“ تو آپؐ کوہِ صفا پر چڑھے۔ اب تو کوہِ صفا کی بس علامت باقی رہ گئی ہے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں وہ باقاعدہ پہاڑی تھی، ایسی پہاڑی کہ جس کے پیچھے کوئی لشکر بھی چھپ سکتا تھا۔ کوہِ صفا پر چڑھ کر آنحضور ﷺ نے عرب کے مروّجہ دستور کے مطابق قوم کو ندا دی۔ یہیں سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دعوت و ابلاغ کے لیے اپنے زمانے میں جو بھی مروجہ طریقے ہوں ان سب کو اختیار کیا جانا چاہیے۔ البتہ اگر حیا اور شرافت کے منافی کوئی شے ہو تو اس سے احتراز کیا جائے۔ اس دور میں غارت گری اور لوٹ مار کے لیے قبائل ایک دوسرے پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ یہ حملہ عام طور پر رات کو ہوتا، بلکہ رات کے بھی پچھلے پہر small hours of the morning میں، یعنی رات کے دو، تین، چار بجے، جبکہ نیند کا انتہائی غلبہ ہوتا ہے۔ اس وقت سوئے ہوؤں پر آ کر ٹوٹ پڑنا اور قتل و غارت گری اور لوٹ مار کر کے بھاگ جانا، یہ ان کا ایک عام رواج تھا۔ لہٰذا کسی قبیلے کے کسی فرد کو

اگر یہ اطلاع مل جاتی کہ کوئی قبیلہ ان پر حملہ آور ہوا چاہتا ہے تو وہ بلند مقام پر چڑھ کر کپڑے اتار کر مادر زاد برہنہ ہو کر نعرہ لگاتا تھا کہ ”وَاصَبَاحَا“ (ہائے وہ صبح جو آیا چاہتی ہے) یعنی جس میں غارت گری، لوٹ مار اور کشت و خون ہوگا۔ اب اس میں دونوں صورتیں یعنی سمع اور بصری جمع ہو جاتیں۔ اس لیے کہ جہاں تک تو اس کی آواز جا رہی ہوتی وہاں تک لوگ اس کی آواز کو سنتے اور دوڑے چلے آتے اور جہاں اس کی آواز نہیں جا رہی ہوتی تو وہ کھڑا ہو کر عریاں نظر آتا۔ اسی لیے اسے ”نذیر عریاں“ کہا جاتا تھا، یعنی وہ خبردار کرنے والا، متنبہ کرنے والا جو بالکل ننگا ہو گیا ہو۔ حضور ﷺ نے بھی قوم کو آگاہ کرنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا اور کوہِ صفا پر چڑھ گئے۔ آپؐ نے اس طریقے میں صرف یہ کمی کی کہ آپؐ نے کپڑے نہیں اتارے، کیونکہ ظاہر ہے یہ حیا و فطرت کے خلاف ہے اور آپؐ کے لیے ایسا کرنا ناممکن تھا، لیکن نعرہ وہی لگایا کہ ”وَاصَبَاحَا“۔

اب لوگ آ کر جمع ہو گئے اور انہوں نے آپؐ سے اس کا سبب دریافت کیا۔ آپؐ اونچائی پر کھڑے تھے، آپؐ نے قوم کو اپنی دعوت پیش کی۔ اس پر آپؐ کا چچا ابولہب کہنے لگا ”تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟“ ”تمہارے لیے ہلاکت و بربادی ہو، کیا تم نے ہمیں اس کام کے لیے جمع کیا ہے؟“ ہم تو سمجھے تھے کہ تم واقعتاً کوئی خبر دینے والے ہو، کوئی بات بتانے والے ہو۔ نوٹ کیجیے کہ حضور ﷺ نے پہلے فرمایا کہ لوگو! میں اگر تمہیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمن کا لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو تم میری بات مانو گے یا نہیں؟ یعنی وہ پہاڑی اتنی بڑی تھی کہ اس کے پیچھے کوئی لشکر چھپ سکتا تھا۔ انہوں نے کہا ضرور، اس لیے کہ آپؐ پہاڑی کی بلندی پر کھڑے ہیں اور پہاڑ کے دونوں جانب دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپؐ نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں، آپؐ تو الصادق اور الامین ہیں۔ آپؐ نے لوگوں سے پہلے یہ گواہی لے کر بات کی ہے کہ میں تمہیں اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہوں، آخرت کے محاسبے سے خبردار کرتا ہوں۔ جس پر آپؐ کے چچا نے کہا تھا کہ ”تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟“ اس پر پھر یہ سورۃ نازل ہوئی:[1]

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝١ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝٢ سَيَصْلٰى

(۱) صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب وانذر عشیرتك الاقربین وباب قوله ان هو الا نذیر لكم بین یدی عذاب شدید، وباب قوله سیصلی نارا ذات لهب۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب فی قوله وانذر عشیرتك الاقربین۔

نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ﴿٣﴾ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ﴿٤﴾ فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ﴿٥﴾﴾

یہ میں نے آنحضور ﷺ کی دعوت کے دو مناظر آپ کو دکھائے ہیں' اندازہ کیجیے کہ دل کو توڑ دینے والا آغاز ہے' انسان کے لیے کس قدر ہمت شکن اور صبر آزما ہے یہ معاملہ جس سے کہ آغاز ہوا ہے۔

دس برس کی محنت شاقہ کا حاصل

الغرض حضور ﷺ کی پورے دس برس کی محنت و مشقت کو ذہن میں رکھئے کہ آپؐ جیسا مبلغ' آپؐ جیسا مربی' مزکی اور معلم نہ پہلے پیدا ہوا نہ کبھی ہو سکتا ہے' کیونکہ حضور ﷺ کی نظیر محالِ مطلق ہے۔ آپؐ کی نظیر کوئی ہوئی ہے نہ ہو گی۔ لیکن مکہ میں آپؐ کی دس برس کی شب و روز کی محنت شاقہ کا تصور کیجیے' جس میں دن کی مشقت کا یہ عالم ہے کہ ﴿اِنَّ لَكَ فِى النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا﴾ آپؐ دن کے اوقات میں گھوم رہے ہیں' گلی کوچوں میں تبلیغ کر رہے ہیں' گھر گھر جا کر دستک دے رہے ہیں اور رات کی یہ کیفیت ہے کہ ﴿قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٢﴾ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ﴿٣﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿٤﴾﴾ آپؐ دن میں لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں تو رات کو کھڑے ہو کر جھولی پھیلا کر اللہ سے دعا کر رہے ہیں کہ اے پروردگار! عمر بن خطاب اور عمرو بن ہشام میں سے کسی ایک کو میری جھولی میں ڈال دے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی دس برس تک شب و روز کی محنت شاقہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوسوا سو یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو افراد آپؐ کے گرد جمع ہو گئے۔ ۶۱۰ عیسوی میں وحی کا آغاز ہوا تو لگ بھگ ۶۲۰ عیسوی کو حضور ﷺ نے عام الحزن یعنی غم کا سال قرار دیا۔ کیونکہ اسی سال حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا۔ گھر میں دلجوئی کرنے والی ایک وفادار' وفا شعار اور محبت کرنے والی زوجہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ ظاہر بات ہے کہ باہر سے آدمی تکدر لے کر آتا ہے تو مونس و غم خوار شریکِ حیات اسے زائل کرنے میں مددگار ہوتی ہے۔ کوئی پاگل کہتا ہے' کسی نے مجنون کہہ دیا ہے' کسی نے شاعر کہہ دیا ہے' کسی نے کہا کہ یہ ہم پر دھونس جماتے ہیں' انہوں نے ایک عجمی غلام کو اپنے گھر کے اندر بند کر رکھا ہے جو بڑا عالم فاضل ہے' تورات اور انجیل کا جاننے والا ہے' یہ اس سے ڈکٹیشن لیتے ہیں' اسے یاد کر کے پھر ہم پر آ کر دھونس جماتے ہیں۔ حضور ﷺ سب کچھ سنتے تھے۔ قرآن مجید میں اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ آپ ﷺ کا قلب انتہائی

حساس تھا' اور یہ باتیں سن کر آپؐ کو رنج اور افسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ﴾ یعنی ''اے نبی! ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس سے آپ کا سینہ بھنچتا ہے''۔ آپ کو تکدر' غم' رنج اور افسوس ہوتا ہے کہ یہی تو وہ لوگ تھے جو کبھی میری راہ میں اپنی آنکھیں بچھاتے تھے' یہی لوگ مجھے صادق اور امین کا خطاب دیتے تھے' یہ مجھ سے انتہائی محبت کرنے والے لوگ تھے' لیکن انہی میں سے آج کوئی مجنون کہہ رہا ہے' کوئی پاگل کہہ رہا ہے' کوئی شاعر' کوئی ساحر' کوئی مسحور اور کوئی کذاب کہہ رہا ہے (نقل کفر کفر نباشد) یہ سب کچھ سن کر آپ گھر آتے تھے تو گھر پر کوئی تسلی دینے والی تھی' لیکن اب وہ نہیں رہی تھی۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ واقعات بڑے اہم ہیں۔ جب پہلی وحی آئی تو حضور ﷺ پر ایک دہشت اور گھبراہٹ کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ آپ ﷺ کی زندگی میں یہ عالم بشریت کا پہلا معاملہ تھا جو عالم ملکیت کے ساتھ ہوا تھا۔ غارِ حرا میں جبرائیل سے پہلی ملاقات ہوئی تھی' اس سے آپ ﷺ پر طبعاً گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ آپ گھر آئے تو کانپ رہے تھے' پھر بخار ہوا اور اس میں آپؐ نے کہا ہے کہ ''خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِىْ'' یعنی مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے۔ ایسے میں وہی غم خوار اور ہمت بندھانے والی زوجہ محترمہ تھیں جنہوں نے کہا کہ ''اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا' آپؐ فکر مت کیجیے' آپؐ یتیموں کی سرپرستی کرتے ہیں' بیواؤں کی خبر گیری کرتے ہیں' آپؐ بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں' غریبوں کی خدمت کرتے ہیں' اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا''۔

آنحضور ﷺ کی پچیس برس تک کی زندگی بڑی محنت و مشقت اور افلاس میں گزری ہے۔ عین بچپن میں آپؐ بھیڑ بکریاں چراتے رہے۔ حضور ﷺ کے اپنے الفاظ ہیں کہ میں چند ٹکوں کے معاوضے میں (عَلٰى قَرَارِيْطَ) اہل مکہ کی بھیڑ بکریاں چراتا رہا۔[1] اس لیے کہ ابو طالب بہت ہی مفلس انسان تھے۔ حضور ﷺ کی سرپرستی تو وہ کر رہے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خاندان ابو طالب کی پرورش رسول اللہ ﷺ نے اپنی محنت و مشقت اور مزدوری سے کی ہے۔ پھر آپؐ نے ملازمت کی شکل میں تجارت شروع کی۔ یہ مشقت اور افلاس کے دن تھے' جن کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ﴿٨﴾﴾ ''اللہ نے آپ کو تنگ دست پایا تو آپ کو غنی کر دیا''۔ اللہ نے آپ کو غنی کس طرح سے کیا؟ پچیس برس کی عمر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاجارة' باب رعی الغنم علی قراریط

شادی ہوئی جو عرب کی متمول ترین خاتون تھیں۔ یہ شادی حضرت خدیجہ ؓ کی اپنی فرمائش پر ہوئی۔ آپ ؓ انتہائی محبت کرنے والی شریکۂ حیات تھیں۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جو حضور ﷺ کے پچیس سال سے لے کر پچاس سال کی عمر کے درمیان کہیں پیش آیا کہ حضور ﷺ ایک دفعہ کہیں مکہ مکرمہ سے باہر نکل گئے۔ مکہ کے باہر پہاڑوں کے درمیان مختلف وادیاں ہیں' ایک وادی میں آپ ؐ نے دیکھا کہ کوئی قبیلہ آ کر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے جو انتہائی مفلوک الحال ہے' جن کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے' تن پر کپڑے نہیں ہیں۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر آپ گھر آئے اور انتہائی ملول اور غمگین ہو کر چادر لے کر لیٹ گئے۔ اب حضرت خدیجہ ؓ نے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں فلاں وادی میں گیا تھا اور میں نے دیکھا کہ وہاں ایک قبیلہ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے جس کا حال یہ ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ میرے پاس دولت نہیں ہے کہ میں ان کی مدد کروں۔ کیونکہ سرمایہ تو حضرت خدیجہ ؓ کا تھا' آپ ﷺ کی اپنی ذاتی دولت تو نہیں تھی۔ اس پر حضرت خدیجہ ؓ نے فرمایا کہ آپ ؐ جائیے اور قریش کے بڑے بڑے سرداروں کو بلا لائیے۔ حضور ﷺ انہیں بلا کر لائے تو اتنی دیر میں حضرت خدیجہ ؓ نے اشرفیوں کا اتنا بڑا ڈھیر لگا دیا کہ جب حضور ﷺ آ کر بیٹھے تو اس کے پیچھے چھپ گئے۔ حضرت خدیجہ ؓ نے سردارانِ قریش سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ سب گواہ رہیں' میں نے یہ ساری دولت حضرت محمد ﷺ کے حوالے کر دی ہے' وہ جیسے چاہیں اسے خرچ کریں۔ حضرت خدیجہؓ ایسی بیوی تھیں' انہوں نے ہر طرح سے آپ ؐ کا ساتھ دیا۔ حضرت خدیجہ ؓ کا کیا مقام تھا' ہم میں سے اکثر اس سے واقف نہیں۔ ہمارے ہاں تو بعض محترم شخصیات کے مابین افضلیت کا جھگڑا ہے ؏

اے گرفتارِ ابوبکر و علی ہشیار باش!

اہل سنت کے ہاں حضرت ابوبکر ؓ کی افضلیت اور اہل تشیع کے نزدیک حضرت علی کی افضلیت مسلمہ ہے اور دونوں اسی میں گرفتار ہیں۔ اسی طرح حضرت عائشہ ؓ اور حضرت فاطمہ ؓ کی افضلیت کا جھگڑا ہے۔ ایک گروہ حضرت عائشہ ؓ کو اور دوسرا گروہ فاطمہ ؓ کو بہت بلند کرتا ہے' لیکن حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا ذکر اوّل تو کہیں ملتا نہیں' اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو بہت کم۔ دو تین سال پہلے جب میں ایران گیا تھا وہاں کے مشاہدات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انہوں نے

وہاں خواتین یونیورسٹی قائم کی ہے جس کا نام ''جامعۃ الزہراء'' رکھا ہے۔ انہوں نے اس یونیورسٹی کا نام حضرت فاطمۃ الزہراء ؓ کے نام پر رکھا ہے۔ اس یونیورسٹی کے چوٹی کے سٹاف اور انتظامیہ سے جب ایک ملاقات میں مَیں نے کہا کہ کاش کہ آپ نے اس کا نام جامعہ خدیجۃ الکبریٰ (ؓ) رکھا ہوتا تو وہ چونکے۔ میں نے کہا کہ دیکھئے' سنیوں اور شیعوں کے مابین یہ تفریق ہے کہ جب بھی کوئی سنی بچیوں کا مدرسہ بنائے گا تو اس کا نام ''مدرسہ العائشہ للبنات'' رکھے گا' جبکہ شیعہ حضرت فاطمہؓ کے نام پر مدرسہ بنائے گا' لیکن حضرت فاطمہ ؓ کی والدہ حضرت خدیجہ ؓ جو صدیقۃ الکبریٰ ہیں' ان کو فراموش کر دیا جاتا ہے جس طرح صدیق اکبر حضرت ابوبکر ؓ ہیں اسی طرح الصدیقۃ الکبریٰ حضرت خدیجہ ؓ ہیں۔ حضرت مریم کے بارے میں قرآن حکیم میں ''صدیقہ'' کا لفظ آیا ہے: ﴿وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ﴾۔ اس امت کی صدیقۃ الکبریٰ حضرت خدیجہ ؓ ہیں۔

حضرت خدیجہ ؓ کا ایک واقعہ بیان کرتا چلوں۔ آغازِ وحی کے بعد جبکہ حضور ﷺ کو عالم بشریت اور عالمِ ملکیت کے درمیان اتصال کا نیا تجربہ ہوا تھا اور جس کی وجہ سے آپ ؐ پر خوف کی سی کیفیت تھی اور ایک تشویش کا سا انداز تھا تو ایک روز حضرت خدیجہ ؓ نے آپ ﷺ سے کہا کہ اب جب وہ فرشتہ یا بدروح جو بھی ہے' آپ ؐ کے پاس آئے تو مجھے بتائیے گا۔ حضرت جبرائیل ؑ آئے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ آ گئے ہیں۔ اب حضرت خدیجہ ؓ نے اپنے بال کھول لیے اور حضور ﷺ کو اپنی آغوش میں لے لیا اور پوچھا کہ کیا اب بھی وہ نظر آ رہا ہے؟ آپ ؐ نے فرمایا: نہیں! اس پر حضرت خدیجہ ؓ نے کہا یقیناً یہ بدروح نہیں ہے' فرشتہ ہے' جس نے حیا کی ہے' اگر کوئی بدروح ہوتی تو وہ لذت لیتی اور غائب نہ ہوتی۔ اب آپ ان کی عظمت فکر' سوچ اور شعور کی بلندی کا اندازہ کیجیے۔

بہر حال سال ۱۰ نبوی میں حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔ اسی سال ابوطالب بھی انتقال فرما گئے۔ اس طرح قبائلی زندگی میں حضور ﷺ کو جو ایک تحفظ حاصل تھا وہ ختم ہو گیا۔ ہجرت کے بعد جب رسول اللہ ﷺ نے اوس' خزرج اور مہاجرین کے درمیان پہلا معاہدہ کرایا تھا تو اس میں یہ شق بھی شامل تھی کہ اگر کوئی ایک مسلمان بھی کسی کو پناہ دے دے گا تو وہ سب کی طرف سے شمار ہو گی۔ یہی معاملہ قبائل کا ہوتا تھا کہ اگر کوئی ایک شخص کسی کو پناہ دے دیتا تھا تو وہ پورے قبیلے کی طرف سے ہوتی تھی۔ اس حوالے سے خاندان بنو ہاشم کی سرداری ابوطالب کے پاس تھی جو کہ

آپ ؐ کو تحفظ دے رہے تھے۔ اگرچہ ایمان نہیں لائے تھے لیکن ان کو آپ ؐ سے طبعی محبت تھی اور اس طبعی محبت کی بنیاد پر انہوں نے حضور ﷺ پر خاندان بنو ہاشم کا سایہ کیا ہوا تھا۔ اب ظاہر بات ہے کہ اگر دوسرے قبیلے اور ان کے سردار حضور ﷺ کے خلاف کوئی اقدام کرتے تو یہ گویا کہ بنو ہاشم کے خلاف اعلانِ جنگ ہو جاتا اور خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ دس برس تک کسی کو حضور ﷺ پر اقدام کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ ابو طالب کے پاس سفارتیں لاتے رہے اور لالچ پیش کیا کہ آپ ان سے کہیے کہ اگر انہیں دولت چاہیے تو ہم سیم و زر کے انبار لگا دیتے ہیں' انہیں کوئی سیادت چاہیے تو ہم انہیں اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں' اگرچہ ہمارا مزاج ایسا نہیں ہے کہ ہم کسی کو بادشاہ مانیں' لیکن ان کو مان لیں گے' اور اگر کہیں شادی کرنا چاہیں تو اشارہ کر دیں' قریش کے جس بڑے گھرانے میں کہیں گے شادی کر دیں گے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ چچا جان! چاہے یہ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی میں اپنی اس دعوت سے باز نہیں آؤں گا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ دعوت توحید سے باز آ جائیں' ہمارے معبودوں کو برا بھلا نہ کہیں۔

جب جناب ابو طالب بسترِ مرگ پر تھے اس وقت قریش کی جانب سے آخری سفارت آئی اور انہوں نے آخری چیلنج کیا کہ اے ابو طالب! اب بھی اگر تم اپنے بھتیجے کی پشت پناہی سے باز نہیں آتے تو ٹھیک ہے' ہمارا الٹی میٹم ہے کہ میدان میں آ کر مقابلہ کر لو یا اپنے بھتیجے کو روک لو۔ اس پر ابو طالب نے حضور ﷺ کو بلایا اور کہا: ''بھتیجے! مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈال جو میں برداشت نہ کر سکوں''۔ ظاہر بات ہے کہ اکیلا خاندان بنو ہاشم پورے قبیلہ قریش کا مقابلہ کیسے کر سکتا تھا؟ پھر خود ابو طالب نہایت ضعیف ہو گئے تھے اور تقریباً بسترِ مرگ پر تھے۔ ابو طالب کی اس بات پر حضور ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ دنیا میں اسبابِ عالم کے اعتبار سے ایک ہی سہارا تھا وہ بھی آج جواب دے رہا ہے۔ تاہم آپ ؐ نے کہا: اب یا تو یہ بات پوری ہو کر رہے گی یا میں اپنے آپ کو اسی میں ہلاک کر دوں گا' میرے لیے پسپائی (retreat) کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بہرحال عام الحزن کے سال میں ابو طالب کا بھی انتقال ہو گیا اور بنو ہاشم کا سردار ابو لہب بن گیا جو خود انتہائی زہریلا دشمن تھا اور جس نے آغازِ دعوت پر ہی حضور ﷺ سے کہہ دیا تھا کہ ''تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟'' یہ وہ بدبخت شخص تھا جس نے اپنے دونوں بیٹوں سے حضور ﷺ کی دونوں صاحبزادیوں کو طلاق

دلوائی۔ آنحضور ﷺ کی دو صاحبزادیوں کی نسبت ابو لہب کے دو بیٹوں کے ساتھ طے تھی۔ اور وہاں تو نسبت کا طے ہو جانا ایک طرح سے نکاح ہی ہوتا تھا۔ ابو لہب کے اکسانے پر ان دونوں نے نہایت گستاخانہ اور توہین آمیز انداز میں آ کر حضور ﷺ کے سامنے کھڑے ہو کر کہا کہ ہم تمہاری دونوں بیٹیوں کو طلاق دیتے ہیں۔ حضور ﷺ نے یہ سارے صدمے جھیلے ہیں۔

یومِ طائف۔ حیاتِ طیّبہ کا شدید ترین دن

ابو طالب کی وفات سے چونکہ حضور ﷺ کو حاصل وہ ظاہری تحفظ ختم ہو گیا تھا اور اب اندیشہ ہے کہ قریش دار الندوہ میں جو چاہیں گے فیصلہ کریں گے' لہٰذا آپ ؐ نے طائف کا سفر اختیار فرمایا۔ یہ حضور ﷺ کی مکی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے آپ ؐ کا شعب بنی ہاشم کے اندر گھیراؤ اور مقاطعہ رہا اور کھانے پینے کی چیزیں روکی گئیں۔ اس دوران پورے خاندان بنو ہاشم کو بدترین قسم کی فاقہ کشی جھیلنی پڑی' حالانکہ وہ سب کے سب ایمان تو نہیں لائے تھے' لیکن اس جرم کی پاداش میں کہ بنو ہاشم محمد ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑ رہے' اس پورے خاندان کا سماجی بائیکاٹ کیا گیا' جس کے نتیجے میں خاندان بنی ہاشم تین سال تک شعب بنی ہاشم (جسے شعب ابی طالب بھی کہتے ہیں) میں محصور رہا۔ ان تین سالوں کے دوران کھانے پینے کی کوئی چیز اُن تک نہیں جانے دی گئی۔ وادی کے دونوں اطراف میں پہرے لگا دیے گئے' چنانچہ کوئی وہاں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ حکیم بن حزام جیسا کوئی اللہ کا بندہ جو بنیادی طور پر نیک شخصیت تھی' وہ کہیں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اور دوسری طرف نیچے اتر کر کوئی چیز پہنچا دیتے' کیونکہ وہ حضرت خدیجہ ؓ کے بہت قریبی عزیز تھے' ورنہ تو وادی کے دونوں سروں پر پہرے تھے۔ وہ وقت بھی آیا کہ بنو ہاشم کے پھول جیسے بچے بلک رہے ہیں اور ان کے پاس کھانے کی کوئی چیز نہیں' سوائے اس کے کہ سوکھے ہوئے چمڑے ابال کر پانی ان کے حلق میں ٹپکایا گیا۔

لیکن حضور ﷺ کے لیے ذاتی طور پر جو سخت ترین مرحلہ آیا وہ یومِ طائف تھا جس کی گواہی حضور ﷺ کے اپنے قول میں موجود ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ ؓ نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ ؐ پر یومِ اُحد سے بھی کوئی زیادہ دن سخت گزرا؟ ظاہر بات ہے کہ ان کے ہوش میں یومِ اُحد کے دوران حضور ﷺ زخمی ہوئے' آپ ؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے' خون کا فوارہ چھوٹا'

آپ ؐ پر بے ہوشی طاری ہوئی' آپ ؐ کے زبانِ مبارک سے ایک بددعا بھی نکل گئی کہ ((كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ خَضَبُوْا وَجْهَ نَبِيِّهِمْ بِالدَّمِ)) [1] ''وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کے چہرے کو خون سے رنگین کر دیا۔'' پھر یہ کہ ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوگئے جن میں اَسَدُ اللّٰہِ وَاَسَدُ رَسُوْلِہٖ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے' جو آپ ؐ کے چچا زاد' خالہ زاد' دودھ شریک بھائی اور ساتھ میں کھیلے ہوئے ہمجولی بھی تھے۔ ان کی لاش آپ ؐ کے سامنے آئی تو دیکھا کہ ناک' کان' کٹے ہوئے اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ چبایا گیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک سخت ترین یومِ احد تھا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ پر سخت ترین دن یومِ طائف تھا۔

آپ ؐ مکے سے مایوس ہو کر طائف گئے۔ اور نوٹ کیجیے کہ یہ واحد موقع جہاں نظر آتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں ہیں' ورنہ وہ تو سائے کی طرح ساتھ رہنے والی شخصیت تھی۔ اس موقع پر صرف آپ ؐ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپ ؐ کے ساتھ تھے' جو مُنہ بولے بیٹے بھی قرار دیے گئے تھے۔ مکے سے طائف کے لیے دو راستے ہیں' آج بھی آپ وہاں جائیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے کیسے پہاڑوں کو کاٹ کر سڑک بنائی ہوگی۔ آپ ؐ نے عام راستہ سے گریز کرتے ہوئے دشوار گزار پہاڑی راستہ اختیار فرمایا۔ اس لیے کہ عام راستے پر تو خطرہ ہوسکتا تھا کہ کہیں حملہ نہ ہو جائے۔ غالباً' دارالندوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

طائف جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے تین سرداروں کے سامنے اس اُمید پر اپنی دعوت پیش کی کہ ان میں سے کوئی ایک بھی دعوت قبول کر لے اور ایمان لے آئے تو میں یہاں منتقل ہو جاؤں اور یہ میرا دارالہجرت بن جائے۔ لیکن حکمتِ خداوندی اور مشیتِ الٰہی میں یہ شرف یثرب کے لیے طے تھا' طائف کے مقدر میں نہ تھا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سوچ بچار کے حوالے سے طائف پہنچے۔ تینوں سرداروں نے کلیجے سے پار ہونے والے جواب دیے۔ ایک نے کہا یہاں سے فوراً روانہ ہو جاؤ' اگر تم واقعی رسول ہو اور میں نے کوئی توہین کر دی تو میں مارا جاؤں گا' اور اگر تم جھوٹے ہو تو جھوٹے کو میں منہ نہیں لگانا چاہتا۔ دوسرے نے کہا مکہ اور طائف میں تمہارے سوا اللہ کو رسول بنانے کے لیے کوئی اور نہیں ملا تھا؟ قرآن حکیم میں ان کے یہ دل آزار الفاظ نقل کیے گئے ہیں: ﴿وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝٣١﴾

(۱) سنن ابن ماجہ' کتاب الفتن' باب الصبر علی البلاء۔ ومسند احمد' ح ۱۲۷۲۵

(الزخرف) ''یعنی ان دو بستیوں میں کوئی شخص بڑی عظمت والا ہوتا' اس کی جائیداد مکے میں بھی ہوتی اور طائف میں بھی' ایسا شخص اللہ کو نبی بنانے کے لیے نہیں ملا تھا؟ تم جیسا مفلوک الحال یتیم شخص جس کا اپنا کوئی ذاتی سرمایہ نہیں تھا' کوئی سرمایہ تھا تو وہ بھی بیوی کا تھا' یہ شخص اللہ نے چنا ہے؟ بہرحال آپ ؐ ان سے مایوس ہو کر واپس روانہ ہونے لگے تو ان بدبختوں نے گلیوں کے آوارہ چھوکروں کو اشارہ کر دیا کہ ذرا ان کی خبر لو۔ چنانچہ انہوں نے پتھراؤ شروع کر دیا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اس پتھراؤ کا آگے ڈھال بن جانے کی پوری کوشش کی' لیکن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اگر سامنے سے آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ڈھال بنتے تو وہ پیچھے سے پتھراؤ شروع کر دیتے اور اگر وہ پیچھے جاتے تو سامنے سے پتھراؤ شروع کر دیتے۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈی کو نشانہ بنایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پنڈلیاں بھی زخموں سے چور ہوگئیں۔ خون بہہ بہہ کر نعلین کے اندر جا کر جم گیا۔ وہاں سے آپ ؐ نکلے' ایک جگہ ٹھہرے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر فریاد آ گئی:

اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْا ضُعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ ، اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ وَاَنْتَ رَبِّيْ! اِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ؟ اِلٰى بَعِيْدٍ يَتَجَهَّمُنِيْ اَمْ اِلٰى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهُ اَمْرِيْ؟ اِنْ لَمْ يَكُنْ عَلَيَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِيْ! وَلٰكِنْ عَافِيَتُكَ هِيَ اَوْسَعُ لِيْ ، اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمٰتُ وَصَلُحَ عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ مِنْ اَنْ يَّنْزِلَ بِيْ غَضَبُكَ اَوْ تَحُلَّ عَلَيَّ سَخَطُكَ ، لَكَ الْعُتْبٰى حَتّٰى تَرْضٰى ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ! [1]

''اے اللہ! میں تیری ہی جناب میں اپنی بے بسی' وسائل و ذرائع کی کمی اور لوگوں میں میری جو رسوائی ہو رہی ہے' اس کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا ربّ ہے اور میرا بھی! اے پروردگار! تو مجھے کن کے سپرد کر رہا ہے؟ وہ دور دراز کے لوگ جن کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں' کہ وہ مجھے تختۂ مشق بنا لیں! یا تو نے میرے سارے معاملات کو دشمنوں کے قابو میں دے دیا؟ پھر بھی اگر مجھ پر تیرا غصہ نہیں ہے تو مجھے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے' لیکن کچھ بھی ہو' تیری عنایات تو مجھ پر بے پایاں ہیں۔

(۱) سیرت ابن ہشام بحوالہ تاریخ الطبری ۳۴۵/۲

میں تیرے چہرۂ انور کے نور کی پناہ میں آتا ہوں جس سے تمام اندھیارے دور ہو جائیں اور جس کے پرتو سے دنیا اور آخرت کا معاملہ درست ہو جائے‘ اس سے کہ مجھ پر تیرا غصہ بھڑکے یا تیرا غضب ٹوٹے‘ منانا ہے‘ اس وقت تک منانا ہے جب تک تو راضی نہ ہو جائے۔ نہ قابو ہے نہ زور ہے‘ مگر تیری ہی مدد سے۔‘‘

گویا پہلے آنحضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کی‘ اس کے بعد آپ ﷺ نے مقامِ عبدیت والی بات کہی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو ’’عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ‘‘ والی دو نسبتیں حاصل ہیں‘ مقامِ عبدیت کا تقاضا کچھ اور ہے‘ یعنی سرِ تسلیم خم کر دینا کہ کوئی شکوہ شکایت زبان پر نہ آئے۔ چنانچہ عرض کیا: ((اِنْ لَمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ)) ’’اے اللہ! (اس سب کے باوجود) اگر تو ناراض نہیں ہے تو پھر مجھے کوئی پرواہ نہیں!‘‘ گویا ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!

اندیشہ ہے کہ کہیں تو ناراض نہ ہو گیا ہو۔ جیسے ابتداء میں وحی کی آمد کا سلسلہ رُک گیا تھا تو آپؐ کو اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں اللہ ناراض نہ ہو گیا ہو کہ وحی کا سلسلہ بند ہو گیا۔ پھر یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿وَالضُّحٰی ۝۱ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۝۲ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ۝۳ وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی ۝۴﴾

اسی کو فارسی میں کہتے ہیں ’’عشق است ہزار بدگمانی‘‘‘ یعنی جہاں عشق و محبت کا معاملہ ہوتا ہے وہاں بڑی جلدی بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے کہ کہیں محبوب کسی وجہ سے ناراض تو نہیں ہو گیا‘ اسے میری کوئی بات ناگوار تو نہیں گزر گئی۔ بہرحال خواہ کچھ بھی ہو‘ اس سب کے باوجود اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے‘ تو ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں۔

سفرِ طائف ذاتی طور پر محمد رسول اللہ ﷺ پر ابتلاء و آزمائش‘ امتحان اور سختی کا نقطۂ عروج ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی تصنیف ’’اَلنَّبِیُّ الْخَاتِمُ‘‘ میں اسے سیرتِ طیبہ کا ایک اہم موڑ (Turning Point) قرار دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو خصوصی حفاظت اور protection حاصل ہوئی۔ لیکن طائف سے فوری طور پر واپسی کے بعد عالمِ اسباب میں حضور ﷺ کا معاملہ یہ تھا کہ آپؐ مکے میں داخل نہیں ہو سکتے تھے‘ وہاں آپ ﷺ کے قتل کا فیصلہ ہو چکا تھا‘ داخل ہوں گے تو قتل کر دیے جائیں گے۔ اور جب دار الندوہ میں فیصلہ ہو

چکا ہو تو ایسا اقدام کرنے والے پر کوئی جرم و الزام نہیں‘ اس پر کوئی مقدمہ نہیں بنے گا۔ حضور ﷺ طائف گئے تھے اور وہاں سے خالی ہاتھ لوٹے تھے۔ نوٹ کیجیے میں یہ نکتہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حضور ﷺ کی عالمِ اسباب میں ساری جدوجہد قدم بقدم زمین پر چل کر ہوئی۔ چنانچہ عالمِ اسباب کو استعمال کرتے ہوئے آپؐ نے ایک مشرک اور کافر کو پیغام بھیجا کہ اگر تم مجھے اپنی امان میں لے لو تو میں مکے میں آ جاؤں۔ ابھی میں بتا چکا ہوں کہ قبائلی زندگی کا یہ اصول تھا کہ اگر ایک شخص نے امان دے دی تو سب کی طرف سے امان ہو جائے گی۔ لیکن اس کافر نے انکار کر دیا۔ پھر آپؐ نے زیدؓ بن حارثہ کو ایک دوسرے شخص کے پاس بھیجا‘ لیکن اس نے بھی انکار کر دیا۔ تیسرا شخص مطعم بن عدی شریف النفس تھا۔ اس کے پاس آپ ﷺ کا پیغام پہنچا تو اس نے کہا آپ میری امان میں ہیں آ جائیں۔ آپؐ نے کہلا بھیجا کہ یوں نہیں‘ آؤ اور خود لے کر جاؤ۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ حضور ﷺ ایسے ہی مکے میں داخل ہو جاتے اور کچھ لوگ آپ ﷺ پر فوری طور پر حملہ آور ہو جاتے تو وہ بعد میں کہہ سکتے تھے کہ ہمیں کیا علم کہ انہیں مطعم بن عدی نے امان دی ہے۔ آپ ﷺ نے اس درجے دنیوی اسباب اختیار کیے ہیں۔ اس لیے کہ یہ عالمِ اسباب ہے اور یہاں جو جدوجہد کرنی ہے اس عالمِ اسباب کے اندر رہتے ہوئے اور ان اسباب کو بروئے کار لا کر کرنی ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے ایک مشرک و کافر کی امان لینا قبول کی۔ اور پھر مطعم بن عدی ہتھیار سجا کر اپنے چھ بیٹوں کو لایا اور یہ کہتا ہوا آیا کہ میں نے محمد (ﷺ) کو امان دی اور آج سے محمد (ﷺ) میری امان میں ہیں۔ تب حضور ﷺ مکے میں داخل ہوئے۔ حضور ﷺ کو اس کے احسان کا اتنا پاس تھا کہ غزوۂ بدر میں جو ستر قیدی حضور ﷺ کی قید میں آئے ان کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور وہ ان کی سفارش کرتا تو میں ان ستر کے ستر قیدیوں کو چھوڑ دیتا لیکن مطعم بن عدی کا اس دوران انتقال ہو چکا تھا اور وہ حالت کفر و شرک میں رہا۔

میں نے رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد کے پہلے دس برس کی جھلک دکھائی ہے۔ حضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد کا عرصہ بیس برس ہے۔ عرب میں انقلاب کی تکمیل ۸ ہجری میں ہوئی جب مکہ اور طائف فتح ہو گیا اور غزوۂ حنین میں آپ ﷺ کو فتح حاصل ہوئی۔ اس طرح عرب میں انقلاب برپا ہو گیا۔ لہٰذا مکے کے بارہ برس اور مدینے کے آٹھ برس شامل کر لیجیے تو یہ بیس برس ہوئے۔ اس عرصے کو دو حصوں میں تقسیم کریں‘ دس سال اِدھر اور دس اُدھر۔ پہلے دس سال کا حاصل میں نے

آپ کے سامنے رکھا ہے کہ کل ۱۲۵ یا ۱۵۰ افراد ایمان لائے اور طائف سے واپسی پر آپ ﷺ کی یہ حیثیت نہیں تھی کہ آپؐ مکے میں اپنے بل پر قیام کر سکتے۔ لہٰذا آپؐ ایک کافر و مشرک کی امان لے کر مکہ میں دوبارہ داخل ہوئے۔ یہ دس برس کی محنت شاقہ ہے۔ لیکن اگلے دس برس میں اسلامی انقلاب نہایت تیزی کے ساتھ مکمل ہوا ہے۔

بیعت عقبہ اولیٰ و بیعت عقبہ ثانیہ

طائف سے واپسی کے بعد اسی سال ایامِ حج میں آپؐ مکہ سے باہر مختلف وادیوں میں ٹھہرے ہوئے حاجیوں سے ملاقات کر کے انہیں اسلام کی دعوت پیش کر رہے تھے کہ آپؐ کو یثرب سے آئے ہوئے چھ حاجی مل گئے۔ آپؐ نے ان کے سامنے اپنی دعوت رکھی۔ یہ چھ حاجی قبیلہ خزرج سے تھے۔ یثرب کے یہودی چونکہ یہ کہا کرتے تھے کہ عنقریب نبی آخر الزماں (ﷺ) کا ظہور ہونے والا ہے۔ اور جب ان یہودیوں کے قبیلہ اوس اور خزرج سے جھگڑے ہوتے تھے اور وہ ان قبائل سے مار کھاتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ ابھی تو تم ہمیں دبا لیتے ہو لیکن دیکھو! نبی آخر الزمان ﷺ کے ظہور کا وقت قریب ہے، جب ہم ان کے ساتھ مل کر لڑیں گے تو تم ہمیں شکست نہیں دے سکو گے۔ یہودیوں کی یہ باتیں اہل یثرب کے کانوں میں پڑی ہوئی تھیں۔ لہٰذا جب یثرب سے آئے ہوئے ان حاجیوں کے سامنے حضور ﷺ نے دعوت پیش کی تو انہوں نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نبی ہیں جن کا ذکر یہود کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ یہودی حضور ﷺ پر ایمان لاتے قبیلہ خزرج کے وہ چھ آدمی ایمان لے آئے۔ واپس مدینے جا کر انہوں نے تھوڑی بہت دعوت دی ہوگی، اس کے نتیجے میں اگلے سال حج کے موقع پر بارہ آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کہا کہ ہمیں کوئی مبلغ و معلم اور مقری دیجیے جو ہمیں قرآن پڑھائے، کیونکہ آپ سے تو ہماری ملاقات اب اگلے سال ہوگی۔

آپ کو معلوم ہے کہ عرب میں سفر کرنا آسان کام نہیں تھا، قتل و غارت کا خطرہ رہتا تھا اور قافلے لوٹ لیے جاتے تھے، صرف اشہر حرم، یعنی حج کے مہینوں میں امن و امان ہوتا تھا کہ کوئی کسی کو تنگ نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے حضور ﷺ سے کہا کہ آپؐ ہمیں کوئی قرآن پڑھانے والا دیجیے۔

قرعۂ فال حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے نام نکلا اور آپؐ نے انہیں یثرب سے آئے ہوئے حضرات کے ساتھ روانہ کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد آپؐ نے ایک اور صحابی حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم کو، جو نابینا تھے، یثرب بھیج دیا۔ ان دونوں حضرات نے وہاں دعوت و تبلیغ کا کام کیا اور اس لگن سے لوگوں کو قرآن پڑھایا کہ حضرت مصعب کا نام ہی ''مقری'' پڑ گیا تھا۔ اس دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں اگلے سال پچھتر (۷۵) آدمی مکہ آئے اور بیعت عقبہ ثانیہ ہوگئی، جس کے نتیجے میں یثرب کی طرف ہجرت کا راستہ کھل گیا۔ ان ۷۵ افراد میں اوس اور خزرج کے بڑے بڑے لوگ بھی موجود تھے۔ ان دونوں قبائل کی بحیثیت مجموعی اسلام کی طرف پیش قدمی سے اللہ تعالیٰ کی وہ مشیت اس طور سے پوری ہوئی اور مدینے کی طرف ہجرت ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے بقیہ صحابہ کو تو ہجرت کی اجازت دے دی لیکن خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح اجازت نامہ ملنے کے منتظر رہے۔

اس ضمن میں ایک واقعہ آپ کے سامنے پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضور ﷺ کے ساتھ سفر ہجرت کے لئے بالکل تیار تھے اور آپؐ سے پوچھا کرتے تھے کہ حضور ﷺ! ہجرت کی اجازت آ گئی؟ آپؐ فرماتے ''ابھی نہیں آئی''۔ اس طرح حضرت ابوبکرؓ روزانہ دریافت فرماتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دن ہم نے عجیب نقشہ دیکھا کہ عین دوپہر کے وقت رسول اللہ ﷺ چلے آ رہے ہیں اور آپؐ نے اپنے چہرے اور سر کے اوپر کپڑا اوڑھا ہوا ہے۔ عرب میں دوپہر کے وقت کسی کے ہاں جانا اور ملاقات کرنا نہ آج پسندیدہ بات ہے نہ پہلے کبھی تھی، کیونکہ یہ قیلولہ کا وقت ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہم اس وقت حضور ﷺ کی آمد پر حیران ہوئے۔ آپؐ نے آ کر پہلی بات یہ فرمائی کہ ہجرت کی اجازت آ گئی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے اپنے طور پر دو اونٹنیاں (ایک اپنے لیے اور ایک حضور ﷺ کے لیے) تیار کی ہوئی تھی اور انہیں کھلا پلا کر خوب موٹا کیا ہوا تھا تا کہ خوب تیز دوڑیں اور سفر ہجرت میں کام آئیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے خوشی کے انداز میں عرض کیا کہ حضور! میں نے سفر کے لئے دو اونٹنیاں تیار کر رکھی ہیں۔ آپؐ نے ذرا توقف کے بعد فرمایا: ''ٹھیک ہے، ایک میں استعمال کروں گا لیکن میں اس کی قیمت ادا کروں گا''۔ حضرت ابوبکرؓ یہ سن کر رو پڑے کہ حضور ﷺ مجھ سے بھی یہ مغائرت! یہ حضور ﷺ کی غیرت و حمیت اور خودداری تھی۔ بہرحال مدینے کی طرف سفر ہجرت ہوا۔

مکی دور میں دعوت، تربیت و تزکیہ، تنظیم اور صبر محض، یہ چار چیزیں بیک وقت چلی ہیں۔ ''صبر

محض، تیاری کا دور ہے کہ جب تک اتنی طاقت ہے کہ کفر کے آمنے سامنے کھڑے ہو کر مقابلہ کر سکیں، اس وقت تک اگر تم پر کوئی زیادتی کی جائے تو جھیل اور برداشت کرو اور صبر کرو۔ اس مرحلے پر کوئی جوابی کارروائی نہ کی جائے۔ یہ حضور ﷺ کی کامیابی کے ضمن میں آپؐ کی دور اندیشی اور معاملہ فہمی کا انتہائی نازک معاملہ تھا۔ وحی جلی یعنی قرآن مجید میں کوئی حکم ایسا نہیں آیا تھا کہ اپنے ہاتھ باندھے رکھو۔ لیکن اس حکم کا تذکرہ بعد میں سورۃ النساء میں بایں طور کیا گیا:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ﴾ (النساء:۷۷)

''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو! (اس وقت بعض لوگ چاہتے تھے کہ ہمیں جنگ کی اجازت دی جائے) اب جو انہیں جنگ کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسے ڈر رہے ہیں جیسا اللہ سے ڈرنا چاہیے، یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر، اور کہتے ہیں خدایا! یہ ہم پر جنگ کا حکم تو نے کیوں لکھ دیا؟ ہمیں تو نے کچھ مزید مہلت کیوں نہ دے دی؟''

مکی سورتوں میں اس حکم کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی خفی کے ذریعے سے ہاتھ باندھے رکھنے کا حکم دیا ہو، کیونکہ حضور ﷺ پر وحی جلی ہی نہیں وحی خفی بھی آتی تھی۔ اس سے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ حضور ﷺ کا اپنا تدبر اور آپؐ کی اپنی تدبیر تھی۔ حضور ﷺ کی اپنی سوچی سمجھی رائے تھی کہ کوئی انقلابی جماعت جو ابھی تعداد اور قوت میں تھوڑی ہے، اگر وہ پُرتشدد ہو جائے تو وہ کچل دی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر تشدد کے باوجود صحابہ کرام ؓ پُرتشدد نہیں ہوئے۔ حالانکہ انہیں ستایا اور مارا جا رہا تھا، انہیں گھروں میں نظربند کیا جا رہا تھا، انہیں بھوکا پیاسا رکھا جا رہا تھا۔ خاص طور پر غلاموں پر انتہائی تشدد کیا جا رہا تھا۔ حضرت عمار ؓ کے والدین حضرت سمیہ اور حضرت یاسر ؓ کو تو شہید بھی کر دیا گیا۔ اس سب کے باوجود مسلمانوں کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی گئی۔ یہ انتہائی حکیمانہ اور انتہائی مدبرانہ انداز ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اس

مرحلے پر اگر کہیں جوابی کارروائی ہو جائے تو باطل قوتوں کو ہمیں کچلنے کا پورا جواز مل جائے گا۔ ابھی تو ہمیں وقت چاہیے کہ ہم اپنی دعوت و تربیت کے ذریعے سے اپنی بنیاد (Base) کو وسیع، مستحکم اور مضبوط کریں۔ اس کو علامہ اقبال نے یوں کہا ہے ؏ ''بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن!'' یعنی درویشی کا انداز اختیار کرو اور اس سے موافقت اختیار کر لو اور اسی انداز پر محنت اور کوشش کرتے رہو۔ آخر دعوت و تبلیغ بھی تو درویشی ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ درویش کو اگر کسی نے تھپڑ بھی مار دیا تو وہ اس کو جواب میں تھپڑ نہیں مارے گا۔ درویشی یہ ہے کہ ظلم و زیادتی کے باوجود کوئی جوابی کارروائی نہ کی جائے اور اپنے ہاتھ باندھے رکھے جائیں، ذاتی مدافعت (Self Defence) میں بھی ہاتھ نہ اٹھایا جائے چاہے تمہارے ٹکڑے اڑا دیے جائیں۔ چنانچہ حضرت خباب بن ارت ؓ سے کہا گیا کہ کرتہ اتارو، انہوں نے اتار دیا، ان کی نگاہوں کے سامنے زمین پر دہکتے ہوئے انگارے بچھے ہوئے تھے۔ اب حضرت خبابؓ سے کہا گیا کہ ان انگاروں پر لیٹ جاؤ تو وہ لیٹ گئے۔ اس لیے کہ صبر محض اور ہاتھ باندھے رکھنا محمد عربی ﷺ کا حکم تھا۔ ورنہ یہ کہ آدمی اگر مایوس ہو جائے کہ میرا تو یہ کباب بنانے چلے ہیں اور وہ اقدام کرنے پر آ جائے تو دو چار کو مار کر ہی مرے گا۔ بلی کو بھی اگر آپ کارنر کر لیں اور اسے محسوس ہو کہ میرے لیے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا گیا تو وہ آپ پر حملہ آور ہو جائے گی۔ اسی طرح ایک انسان کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مجھے زندہ کو بھوننے لگے ہیں تو وہ اگر کوئی کارروائی کر دے تو دو چار کو مار کر مرے گا، لیکن محمد عربی ﷺ کی انقلابی جدوجہد میں صبر محض کے مرحلے پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔

مکے کے بارہ برس دعوت و تبلیغ، تربیت و تزکیہ اور تنظیم کے مراحل میں گزرے، جس کا نقطۂ عروج بیعت عقبہ ثانیہ ہے، جس میں حضور ﷺ نے صحابہ کرام ؓ سے عہد لیا۔ حضرت عبادہ بن صامت ؓ روایت کرتے ہیں:

((بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِى الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ، وَعَلٰى اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِى اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ))(۱)

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصية وتحريمها فی معصية۔ وصحیح البخاری (اختصار کے ساتھ) کتاب الاحکام، باب کیف یبایع الامام الناس۔

"ہم نے اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کی تھی کہ آپؐ کا ہر حکم سنیں گے اور مانیں گے، خواہ مشکل ہو خواہ آسانی ہو، خواہ طبیعت آمادہ ہو اور خواہ ہمیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے، خواہ آپؐ دوسروں کو ہم پر ترجیح دے دیں، اور جنہیں بھی آپؐ ذمہ دار بنائیں گے ان سے ہم جھگڑے گے نہیں (ان سے تعاون کریں گے) اور جہاں بھی ہوں گے حق بات (اور صحیح مشورہ) ضرور پیش کریں گے، ہم اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے"۔

یہ ایک عظیم بیعت تھی جس سے ایک تنظیم وجود میں آئی۔

داخلی استحکام کی خاطر اقدامات

مدینے میں آ کر آپؐ نے داخلی استحکام کی خاطر چھ مہینے میں تین کام کیے:

۱) مسجد نبوی کی تعمیر کی جس سے ایک مرکز بن گیا۔ اب یہ دارالندوہ بھی تھی اور دارالمشاورت بھی، یہ دارالامارہ بھی تھی اور دارالصلاۃ بھی تھی۔ یہی دارالتعلیم، دارالتزکیہ اور دارالاحسان بھی تھی۔ اسے آپ خانقاہ، درس گاہ، تربیت گاہ، عبادت گاہ، ایوانِ حکومت، عدالت اور پارلیمنٹ ہاؤس کہہ لیں۔ الغرض مسجد نبوی کی شکل میں ایک مرکز وجود میں آ گیا۔

۲) حضور ﷺ نے انصار اور مہاجرین کے مابین "مواخات" قائم کر کے انہیں بھائی بھائی بنا دیا تاکہ اسلامی جماعت کے دو حصے مربوط ہو جائیں۔

۳) حضور ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ یہ معاہدہ کر کے انہیں جکڑ لیا کہ اگر مدینے پر باہر سے حملہ ہوا تو اس کا سب مل کر جواب دیں گے۔

مستشرقین کی کوتاہ نظری

یہاں میں آپ کو بتاتا چلا ہوں کہ مستشرقین نے اپنی کوتاہ نظری کے باعث رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مکی اور مدنی دور کے طرزِ عمل کو متضاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ ٹائن بی (Toynbee) نے حضور ﷺ کے بارے میں ایک بڑا زہر بھرا جملہ کہا تھا:

"Muhammad failed as a prophet but succeeded as a statesmen."

یعنی محمد (ﷺ) نبی کی حیثیت سے تو ناکام ہو گئے لیکن بحیثیت سیاست دان کامیاب ہوئے"۔

مکے میں دعوت و تربیت، تزکیہ اور صبر محض کا جو نقشہ تھا اس کے نزدیک انبیاء کا کام یہی ہوتا ہے۔ یہی کام تین سال تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ محمد (ﷺ) جب مکے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے (معاذ اللہ) مدینہ کی طرف راہِ فرار اختیار کی۔ مستشرقین ہجرت مدینہ کو "Flight to Madina" کہتے ہیں، حالانکہ یہ فرار نہیں تھا، بلکہ ایک متبادل مرکز (Alternate Base) کی طرف منتقلی تھی۔ پہلے آپؐ نے متبادل مرکز کی تلاش میں طائف کا سفر اختیار فرمایا تھا، لیکن مشیت ایزدی کچھ اور تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ متبادل مرکز (Alternate Base) مدینے کی شکل میں عطا کیا۔ انقلابی جدوجہد میں اقدام کے مرحلہ کے آغاز کے لیے مدینہ کی حیثیت ایک Base کی تھی۔

برطانوی پروفیسر منٹگمری واٹ، جسے ضیاء الحق صاحب نے خاص طور پر پاکستان بلایا تھا، نے سیرت محمدی ﷺ پر دو کتابیں لکھی ہیں:

۱۔ Muhammad at Makka

۲۔ Muhammad at Madina

اس نے ان دونوں کتابوں میں اپنے تئیں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے متضاد پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ مکے والا محمد (ﷺ) کچھ اور ہے، مدینے والا کچھ اور۔ مکے والا محمد (ﷺ) تو داعی، مزکی، مبلغ، مزکی اور درویش ہے اور اس کی سیرت میں واقعتاً نبیوں والا نقشہ نظر آتا ہے جبکہ مدینے والا محمد تو ایک مدبر، منتظم، سٹیٹسمین، سیاست دان اور سپہ سالار ہے۔ اس کے نزدیک یہ دونوں شخصیتیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ "Muhammad at Madina" میں اس نے حضور ﷺ کے لیے مدح اور تعریف کے تمام ممکنہ الفاظ کو جمع کر لیا ہے۔ آپؐ کی دوراندیشی، معاملہ فہمی، آپؐ کی صحیح صحیح صورت حال کے بارے میں صحیح صحیح اقدام کی صلاحیت، آپؐ کی انسان شناسی اور ہر انسان کی ذہنی سطح کا اندازہ کرتے ہوئے اس سے اس کی سطح پر بات کرنا اور ہر انسان سے اس کی صلاحیت و استعداد کے مطابق کام لے لینا جیسی تمام خصوصیات کا تذکرہ اس نے کھلے دل کے ساتھ کیا ہے۔ اس نے حضور ﷺ کی موقع شناسی، تدبر اور سیاست وغیرہ کے جتنے بھی اعلیٰ ترین اوصاف ہیں ان کا ذکر افعل التفضیل (Superlative) کے صیغے میں کیا ہے۔ اس سے ایک مسلمان دھوکا کھاتا ہے کہ یہ کتاب حضور ﷺ کی تعریف میں

لکھی گئی ہے‘ حالانکہ درحقیقت وہ تضاد (contrast) بیان کر رہا ہے کہ بحیثیت سیاست دان (statesman) تو آپؐ کے یہ اوصاف ہیں جبکہ بحیثیت نبوی آپؐ ناکام ہو گئے اور آپؐ ناکام ہو گئے اور آپؐ کو مکے سے بھاگ کر مدینے میں پناہ لینی پڑی۔ یہ وہ زہر ہے جو اس نے گھولا ہے۔ لیکن حضورﷺ کی معاملہ فہمی‘ دوراندیشی اور statesmanship کا اس نے گھٹنے ٹیک کر اعتراف کیا ہے۔ حضورﷺ کے انہی اوصافِ عالیہ کا شاہکار میثاق مدینہ تھا‘ جس میں آپؐ نے مدینہ میں آباد یہودیوں کے تینوں قبیلوں کو پابند کر لیا۔ اگرچہ بعد میں وہ ایک ایک کر کے غداری کے مرتکب ہوتے رہے‘ لیکن ظاہر بات ہے کہ جب وہ غداری بھی کرتے تھے تو چھپ چھپ کر اور ڈرتے ڈرتے‘ کیونکہ وہ اس معاہدے میں جکڑے ہوتے تھے‘ کھلے عام انہیں ان سرگرمیوں کی جرأت نہیں تھی۔ لہٰذا درپردہ سازشیں کرتے رہے‘ وہ کبھی مکے والوں کو ابھارتے‘ کبھی کسی اور کو۔ بعد میں اس معاہدے کی خلاف ورزیوں کے سبب یہودیوں کے تینوں قبائل بنوقینقاع‘ بنوقریظہ اور بنونضیر مدینے سے نکال دیے گئے۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے چھاپہ مار مہموں کا آغاز

حضورﷺ نے مدینے میں ابتدائی چھ مہینے مذکورہ بالا تین کاموں کے لیے صرف کیے اور ساتویں مہینے آپؐ نے چھوٹے چھوٹے چھاپہ مار دستے مکے کی طرف بھیجنے شروع کر دیے۔ اب یہ باطل کو چیلنج دینے کا انداز ہے۔ غزوۂ بدر سے پہلے پہلے آپؐ نے ایسی آٹھ مہمیں روانہ کیں۔ بدقسمتی سے سیرت کی وہ کتابیں جو انگریزی دور میں لکھی گئیں ان کے مؤلفین نے ان واقعات کو اہمیت نہیں دی اور انہیں چھپایا ہے۔ یہاں تک کہ علامہ شبلی نعمانی نے بھی ان کو نقل نہیں کیا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ رسول اللہﷺ کے ان اقدامات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد جنگ کا آغاز محمد رسول اللہﷺ کی طرف سے ہوا‘ قریش مکہ کی طرف سے نہیں۔ جبکہ یورپی استعمار کے دور میں ہمارے اوپر یہ تنقید ہوتی تھی کہ اسلام تو تلوار سے پھیلا ہے ع ”بوئے خون آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!“ اور یہ تو خونی اور جنونی لوگ ہیں‘ یہ دلیل سے بات نہیں کرتے‘ طاقت سے بات کرتے ہیں۔ مغرب کی طرف سے چونکہ مسلسل یہ پروپیگنڈہ ہو رہا تھا لہٰذا ہمارا انداز معذرت خواہانہ سا ہو گیا تھا کہ ”نہیں! حضورﷺ نے تو جنگ نہیں کی‘ آپؐ نے تو دفاع کیا ہے‘ آغاز تو کفار

کی طرف سے ہوا تھا“۔ یہ بات صد فیصد غلط ہے۔ اس لیے کہ حضورﷺ کو اللہ نے دین کو غالب کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ آپؐ مکے سے مدینے وہاں کے نخلستانوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام کرنے تو نہیں آئے تھے‘ وہ تو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس جدوجہد کے اگلے مرحلے یعنی اقدام کی تیاری کے لیے Base فراہم کیا تھا۔ آپؐ اگلے مرحلے کا آغاز زیادہ سے زیادہ چھ مہینے مؤخر کر سکتے تھے تاکہ وہاں اپنی پوزیشن کو مستحکم کر لیں‘ اس سے زیادہ آپ کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ لہٰذا آپؐ نے اپنی پوزیشن مستحکم ہوتے ہی اقدام کا آغاز فرما دیا‘ اور یہ سلسلہ آپؐ کی جانب سے شروع ہوا۔ آپؐ کی آٹھ مہمات غزوۂ بدر سے پہلے ہیں۔ ان میں چار غزوات ہیں جن میں حضورﷺ خود بھی شریک ہوئے اور چار سرایا ہیں جن میں حضورﷺ خود شریک نہیں ہوئے۔

ان مہمات کا مقصد ایک تو قریش کو چیلنج کرنا اور دوسرے مکہ کی معاشی ناکہ بندی (Economic Blockade) تھا کیونکہ اہل مکہ کی معاش کا دار و مدار کلیتاً تجارت پر تھا۔ ان کے تجارتی قافلے شمالاً جنوباً سفر کرتے تھے۔ شمال میں شام کی طرف جانے والا قافلہ بدر سے ہو کر گزرتا تھا۔ بدر مدینے سے اسّی (۸۰) میل کے فاصلے پر ہے اور مکے سے دو سو میل کے فاصلے پر۔ لہٰذا یہ مسلمانوں کی زد میں تھا۔ ادھر جنوب کی سمت میں جو قافلہ یمن کی طرف جاتا تھا وہ وادیٔ نخلہ سے ہو کر گزرتا تھا جو مکہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے اور مدینہ سے اس کا فاصلہ کم از کم تین سو میل کا ہے۔ لیکن آپؐ نے وادیٔ نخلہ میں بھی ایک مہم روانہ فرمائی۔ ان مہموں کا مقصد قریش کو یہ بتا دینا تھا کہ اب تمہاری لائف لائن ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اس کو جدید اصطلاح میں مکہ کی معاشی ناکہ بندی کہیں گے۔ ان مہمات سے آپؐ نے جو دوسرا مقصد حاصل فرمایا وہ قریش کو سیاسی طور پر الگ تھلگ کرنا (Political Isolation) تھا۔ حضورﷺ ان چار مہموں کے دوران جن میں آپؐ بنفس نفیس شریک تھے‘ جہاں بھی گئے آپؐ نے علاقائی قبائل سے معاہدے کیے۔ چنانچہ وہ قبائل جو پہلے قریش کے اتحادی تھے اب یا تو حضورﷺ کے اتحادی ہو گئے‘ یا انہوں نے غیر جانبداری کا معاملہ کیا کہ ہم نہ قریش کے خلاف آپؐ کے ساتھ دیں گے اور نہ آپؐ کے خلاف قریش کی مدد کریں گے۔ لیکن ان دونوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ قریش کے سیاسی اثر و رسوخ کا دائرہ سکڑنے لگا اور محمدﷺ کے سیاسی اثر و رسوخ کا دائرہ بتدریج پھیلنے لگا۔ قرآن مجید میں جو درمیانی دور کی مکی سورتیں ہیں ان میں سے سورۃ الانبیاء میں یہ آیت آئی ہے:

﴿اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا﴾ (آیت ۴۴)

''کیا ان کو نظر نہیں آتا کہ ہم زمین کو مختلف سمتوں سے گھٹاتے چلے آ رہے ہیں؟''

یعنی ہم زمین کو چاروں طرف سے گھیرتے ہوئے مکے کی طرف لا رہے ہیں۔ مکی دور ہی میں ان قبائل میں بھی اسلام پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اب گویا کہ اسلام مکے کی طرف دوسرے قبائل سے پیش رفت کر رہا تھا۔ اب اس کی صورت یہ بنی کہ حضور ﷺ نے ان قبائل کے ساتھ معاہدے کر لیے تو حضور ﷺ کا سیاسی اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا اور قریش کا گھٹتا چلا گیا۔

غزوۂ بدر: مسلح تصادم کا آغاز

رسول اللہ ﷺ کے ان اقدامات کے نتیجے میں تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق قریش کا ایک ہزار کا لشکر نکلا، جس کی دو فوری وجوہات ہو گئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ نخلہ میں آپؐ نے جو گروپ بھیجا تھا اس کی مڈبھیڑ قریش کے ایک تجارتی قافلے سے ہو گئی، اور جس میں مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مشرک مارا گیا اور مسلمان ایک کو اسیر بنانے کے علاوہ مالِ تجارت بھی چھین کر لے آئے۔ اب مکے میں شور مچ گیا کہ محمد (ﷺ) کہ یہ جرأت کہ اس کے آدمیوں نے ہمارا آدمی مار دیا۔ یہ ہجرت کے بعد پہلا قتل تھا اور یہ مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مشرک کا تھا۔ ثانیاً حضور ﷺ نے قریش کے اس تجارتی قافلے کا پیچھا کر کے اسے روکنے کی کوشش کی تھی جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام جا رہا تھا، لیکن یہ قافلہ مسلمانوں کے ہاتھوں بچ نکلا تھا۔ قافلے کی واپسی کے وقت ابوسفیان کو زیادہ اندیشہ لاحق ہوا، کیونکہ یہ ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ تھا جس میں ایک ہزار اونٹوں پر کروڑوں کا مال تجارت لدا ہوا تھا۔ چنانچہ ابوسفیان نے قریش کو ہنگامی پیغام بھیجا کہ مجھے محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں سے خطرہ ہے کہ وہ حملہ کر کے ہمیں لوٹ لیں گے لہٰذا فوری مدد بھیجو۔ دوسری طرف ابوسفیان نے خود راستہ بدل لیا اور بدر سے ہو کر گزرنے کے بجائے نیچے ساحل کے ساتھ ساتھ ہو کر گزر گیا۔ ادھر مکہ میں ابوسفیان کا ہنگامی پیغام پہنچا اور ادھر سے لوگ روتے پیٹتے اور کپڑے پھاڑتے ہوئے آ گئے کہ محمد (ﷺ) کے آدمیوں نے ہمارا ایک آدمی مار دیا ہے تو اس کے نتیجے میں قریش کے مشتعل مزاج (Hawks) کا پلڑا امن پسند لوگوں (Doves) پر بھاری ہو گیا۔ Hawks اور Doves ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ ہر صورت میں لڑنے مرنے پر تیار ہونے والے

Hawks کہلاتے ہیں اور جنگ سے گریز کا مشورہ دینے والے Doves کہلاتے ہیں۔ قریش میں بھی دونوں طرح کے لوگ تھے۔

Hawks میں ابوجہل، عتبہ بن ابی معیط اور بڑے بڑے لوگ تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ چل کر مدینے پر فوج کشی کرو اور محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کو ختم کر دو۔ دوسری طرف ان میں Doves بھی تھے، جن میں ایک بزرگ شخصیت عتبہ بن ربیعہ بھی تھا جو بدر کے میدان میں پہلا مقتول ہے، لیکن وہ بہت شریف النفس انسان تھا۔ دوسرے حکیم بن حزام تھے، جو شاید اندر ہی اندر ایمان لا چکے تھے، لیکن ابھی ظاہر نہیں کیا تھا، وہ بھی بہت شریف انسان تھے۔ یہ دونوں حضرات کہتے تھے کہ اب بلا ہمارے سر سے ٹل گئی ہے، محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی یہاں سے چلے گئے، اب تم محمد کو بقیہ عرب کے حوالے کر دو، اس لیے کہ محمد (ﷺ) تو چین سے بیٹھنے والے نہیں ہیں، انہوں نے اپنی دعوت پھیلانی ہے، تو جو ردعمل ہمارا ہے وہی سارے کے سارے عرب کے لوگوں کا ہوگا، کیونکہ سب مشرک اور بت پرست ہیں۔ اب محمد ﷺ کی ان سے کشمکش ہو گی اور جس میں اگر محمد ﷺ ان پر غالب آ گئے تو ہمارا کیا جائے، وہ بھی تو قریشی ہیں، بنو ہاشم سے ہیں، گویا کہ پورے عرب پر قریش کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اور اگر بقیہ عرب نے محمد ﷺ کو ختم کر دیا تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا اور تمہیں اپنی تلواریں اپنے بھائیوں کے خون سے رنگین نہیں کرنی پڑیں گی۔ آخر محمد ﷺ بھی تو بنی ہاشم سے ہیں۔ بہرحال جب یہ دو چیزیں سامنے آ گئیں تو Doves بے بس ہو گئے اور Hawks طبل جنگ بجا دیا۔ چنانچہ وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے اور ایک ہزار کا لشکر کیل کانٹے سے لیس کر کے لڑائی کے لیے تیار ہو گئے۔

ایک اور بات نوٹ کیجیے کہ جب کفار عین بدر کے میدان میں پہنچ گئے اور ادھر سے حضور ﷺ بھی تین سو تیرہ کی نفری لے کر آ گئے تو لشکر مکہ کو یہ پیغام پہنچ گیا کہ ہمارا قافلہ تو بچ کر نکل گیا ہے۔ چنانچہ حکیم بن حزام اور عتبہ بن ربیعہ ابوجہل کے پاس آئے اور آ کر کہنے لگے کہ ہمارا قافلہ بحفاظت بچ کر نکل گیا ہے، اب لڑائی کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کی حیثیت ایسی ہے کہ اگر آپ چاہیں تو یہ خون ریزی رک سکتی ہے۔ عتبہ بن ربیعہ نے ابوجہل کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ پیشکش بھی کی کہ وہ جو ہمارا ایک آدمی محمد ﷺ کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا اس کا خون بہا میں ادا کرتا ہوں، باقی یہ کہ ہمارا قافلہ تو بچ کر نکل ہی گیا ہے، لہٰذا ہمیں اس خونریزی سے بچنا چاہیے۔

اس پر ابوجہل نے مقتول کے بھائی کو بلا کر کہا کہ تمہارے بھائی کے خون کا بدلہ تمہارے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے' یہ لوگ آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جنگ نہ ہو۔اس نے عرب کے رواج کے مطابق کپڑے پھاڑے اور چیخنے لگا کہ مجھے تو قصاص اور بدلہ چاہیے' مجھے کوئی خون بہا نہیں چاہیے! مزید یہ کہ ابوجہل نے عتبہ کو طعنہ دیا کہ شاید تم پر بزدلی طاری ہوگئی ہے' کیونکہ تمہارا اپنا بیٹا حذیفہ سامنے ہے۔ایک عرب کے لیے تو یہ بہت بڑا طعنہ تھا۔اس نے کہا کہ اچھا یہ تو کل معلوم ہوگا کہ کون بزدل ہے اور کون بہادر ہے۔ چنانچہ اگلے دن سب سے پہلے عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور بیٹے ولید کو لے کر میدان میں آیا اور مبارزت طلب کی۔ ادھر سے تین انصاری صحابی مقابلہ کے لیے نکلے۔عتبہ نے پوچھا: کون ہو تم؟ انہوں نے کہا انصارِ مدینہ۔عتبہ نے کہا: نہیں' ہمیں تم سے کوئی سروکار نہیں' ہمیں اپنے ہم پلہ لوگوں سے لڑنا ہے' ہم ان کاشت کاروں سے لڑنے نہیں آئے۔اس پر پھر حضرت حذیفہ ؓ نے اپنے باپ کے مقابلے میں نکلنا چاہا لیکن حضور ﷺ نے روک دیا۔ پھر حضرت علی' حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ بن حارث ؓ نکل کر میدان میں آئے اور پہلا قتل حضرت حمزہ ؓ کے ہاتھوں عتبہ کا ہوا۔اس طرح وہی شخص جو جنگ روکنا چاہتا تھا' لیکن بزدلی کا طعنہ برداشت نہیں کر سکا' سب سے پہلے واصل جہنم ہوا۔حضرت علی ؓ نے شیبہ کا کام تمام کیا۔ پھر دونوں لشکر باہم ٹکرائے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت سے اہل ایمان کو فتح عطا فرمائی اور اس دن کو ''یوم الفرقان'' قرار دیا گیا۔

یہاں سے حضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد آخری مرحلے میں داخل ہوگئی۔یہ ''مسلح تصادم'' جس کا آغاز غزوۂ بدر سے ہوا' چھ سال جاری رہا۔آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے بارہ سال دعوت وتزکیہ' تنظیم اور صبر محض (کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ) کے مراحل میں گزرے۔یہ مکے کے بارہ برس تھے۔مدینہ میں آ کر آپؐ نے پہلے چھ مہینے میں اپنی پوزیشن مستحکم کی' اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال کے دوران قریش کے خلاف مہمیں بھیجیں جن کے نتیجے میں یہ مسلح تصادم شروع ہوا۔اس طرح گویا کہ سانپ کو بل میں سے نکالا گیا۔میں یہ بات جان بوجھ کر کہہ رہا ہوں۔اس لیے کہ مکہ تو حرم ہے' وہاں جا کر کشت وخون کوئی پسندیدہ شے نہیں ہے۔لہٰذا قریش کو وہاں سے نکالنا ایسے ہی تھا جیسے کہ سانپ کو بل سے نکال کر باہر لے آیا جائے اور پھر اس کی گردن کچلی جائے۔چنانچہ بدر میں ان کے چوٹی کے ستر سردار مارے گئے جس سے ان کی کمر ٹوٹ گئی۔اس کے بعد چھ سال تک مسلسل جنگ لڑی

گئی' جس کے نتیجے میں غزوۂ بدر' غزوۂ احد' غزوۂ احزاب اور غزوۂ خیبر وغیرہ ہوئے۔محمد رسول اللہ ﷺ نے غلبہ دین کی جدوجہد کے لیے پوری تیاری کی تھی۔افراد کو تیار کیا تھا' ان کا تزکیہ کیا تھا' ان کے اندر ولولہ پیدا کر دیا تھا کہ ہر چہ بادا باد' جانیں دینے کو تیار ہیں' انہیں نظم کا خوگر بنا دیا تھا۔ پھر ان کی للّٰہیت اس درجے کو پہنچ چکی تھی کہ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

یہ ساری تیاری کر کے آپؐ میدان میں آئے تھے۔پھر مسلح تصادم کا دَور شروع ہوا اور اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی۔﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾

انقلابِ اسلامی کی توسیع وتصدیر کا مرحلہ

۸ھ یا ۹ھ میں اندرونِ ملک عرب انقلابِ اسلامی کی تکمیل ہوگئی۔البتہ اس کے بعد کا مرحلہ سمجھ لیجیے کسی بھی سچے انقلاب کے لیے آخری مرحلہ انقلاب کی توسیع اور تصدیر ہوتا ہے اور یہ اس کا لٹمس ٹیسٹ (litmus test) ہے۔حقیقی انقلاب صرف وہ ہوتا ہے جو کسی جغرافیائی' قومی اور ملکی حدود کے اندر محدود نہ رہے' بلکہ پھیلتا جائے۔اس لیے کہ انقلاب نظریے کی بنیاد پر برپا ہوتا ہے اور نظریہ کو پاسپورٹ درکار ہوتا ہے نہ ویزا۔جیسے ہوا اور بادل بغیر کسی رکاوٹ کے ادھر سے ادھر جا رہے ہیں اسی طرح نظریہ بھی جائے گا۔نظریہ پھیلے گا تو انقلاب کی توسیع ہوگی۔جو انقلاب اپنے آپ کو انقلاب تو کہے لیکن کسی حدود کے اندر محدود رہ جائے وہ حقیقی انقلاب نہیں' بلکہ اسے صرف ظاہری طور پر انقلاب کہیں گے۔اس کی سب سے بڑی مثال ایران کا انقلاب ہے۔اگرچہ یہ ظاہری انقلاب ہے کہ بادشاہت ختم ہوئی اور علماء کی حکومت قائم ہوگئی' لیکن یہ حقیقی انقلاب نہیں' کیونکہ اس کی توسیع نہیں ہو سکی۔اس کو پاکستان برآمد کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور یہاں کے اہل تشیع نے ۱۹۸۹ء کے انقلابِ ایران کے بعد جارحانہ انداز اختیار کیا تھا' لیکن ان کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔یا پھر یہ انقلاب سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ عراق میں ایکسپورٹ ہو سکتا تھا' کیونکہ وہ ملحق بھی ہے اور وہاں کی پچپن فیصد آبادی شیعوں پر مشتمل ہے' لیکن وہاں بھی خمینی صاحب سے strategic غلطی ہوئی اور دونوں ملکوں میں تصادم ہو گیا اور صدام حسین نے بڑی

ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے اسے عرب اور عجم کی لڑائی کا رنگ دے دیا اور اس طرح گویا عرب نیشنلزم اور ایرانی نیشنلزم مدمقابل آ گئے۔ بہرحال کسی بھی انقلاب کا صحیح لٹمس ٹیسٹ یہ ہے کہ وہ علاقائی حدود سے باہر نکلتا ہے یا نہیں۔ انقلابِ فرانس صرف فرانس تک ہی محدود نہیں رہا' بلکہ پوری دنیا میں پھیلا اور پوری دنیا میں جمہوریت کا دور آیا۔ انقلابِ روس لاطینی امریکہ اور کیوبا تک پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد عربی ﷺ کے انقلاب کا بین الاقوامی اور عالمی مرحلہ بھی فوراً شروع ہو گیا جس کا آغاز حضور ﷺ نے خود فرمایا۔ چنانچہ نہ صرف جزیرہ نمائے عرب تک انقلاب کی تکمیل آپؐ نے بنفسِ نفیس خود فرمائی' بلکہ اگلے مرحلے میں انقلابِ محمدی کی توسیع و تصدیر کے بین الاقوامی اور عالمی مرحلے کا آغاز بھی آپؐ نے فرما دیا۔

اس ضمن میں تین باتیں نوٹ کیجیے کہ جب تک صلح حدیبیہ نہیں ہوگئی' جسے قرآن نے ﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا﴾ قرار دیا' حضور ﷺ نے بیرونِ عرب نہ کوئی داعی اور مبلغ بھیجا اور نہ ہی کوئی نامہ مبارک روانہ فرمایا' بلکہ پوری توجہ عرب کے اندر ہی مرکوز رکھی تاکہ یہاں انقلاب آ جائے۔ دس برس تک آپؐ نے مکے سے باہر قدم نہیں نکالا' سوائے اس کے کہ عکاظ کا جو میلہ لگتا تھا جس میں آس پاس کے قبائل چلے آتے تھے' کبھی کبھار آپؐ وہاں تشریف لے جاتے۔ آپؐ نے پورے دس برس صرف مکے میں اپنی دعوت پیش کی۔ اس کے بعد مزید آٹھ برس تک صرف جزیرہ نمائے عرب تک محدود رہے۔ صلح حدیبیہ کے بعد آپؐ نے صرف نامہ ہائے مبارک بھیجنے شروع کیے۔ آپؐ نے ہرقل شاہِ روم' خسرو پرویز شہنشاہِ ایران' مقوقس شاہِ مصر اور نجاشی شاہِ حبشہ کو نامہ ہائے مبارک بھیجے۔ وہ نجاشی اب فوت ہو چکے تھے جو حضور ﷺ پر ایمان لے آئے تھے۔ ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے' کیونکہ ان کی ملاقات حضور ﷺ سے نہیں ہو سکی۔ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے ان کی صحبت نجاشیؒ کو حاصل ہوئی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کے نامہ ہائے مبارک لے کر جانے والے ایلچیوں میں سے ایک ایلچی کو سلطنت روما کے باج گزاروں نے قتل کر دیا' لہٰذا روما سے ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ چنانچہ پہلے غزوۂ موتہ اور پھر غزوۂ تبوک ہوا۔ آپؐ تیس ہزار نفری لے کر تبوک میں بیس دن تک مقیم رہے۔ شہنشاہِ ہرقل چونکہ یہ پہچانتا تھا کہ آپؐ اللہ کے نبی ہیں اس لیے وہ مقابلے میں نہیں آیا' حالانکہ وہ لاکھوں کی فوج کے ساتھ شام میں پڑاؤ کیے ہوئے تھا۔ بہرحال آپ ﷺ نے عرب کے باہر انقلاب کی

توسیع کا آغاز اپنی حیاتِ طیبہ میں فرما دیا تھا۔

پھر خلفاء راشدین کے دور میں اسلامی افواج نے تین اطراف میں پیش قدمی کی ہے۔ ایک لشکر سیدھا شمال کی سمت بڑھتا ہوا ایشیائے کوچک کی طرف گیا۔ دوسرا لشکر مشرق کی سمت بڑھا اور عراق سے ہوتے ہوئے ایران' ترکستان جو کہ اس زمانے میں بہت بڑا ملک تھا' اور خراسان کی طرف پیش قدمی کرتا گیا۔ جبکہ تیسرا لشکر ذرا سا مغرب کی طرف مڑتے ہوئے شام اور فلسطین سے ہوتا ہوا صحرائے سینا سے گزر کر مصر اور پھر لیبیا وغیرہ کو اسلام کا سایۂ رحمت عطا کرتا ہوا بحر اوقیانوس تک پہنچا۔ اس طرح پہلے تین خلفائے راشدین کے دور میں صرف ربع صدی کے دوران دریائے جیحوں سے بحر اوقیانوس تک (From Oxus to Atlantic) اور ادھر شمال میں کوہِ قاف تک' اس پورے علاقے میں انقلابِ محمدیؐ برپا ہو گیا اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام نافذ ہو گیا۔ یہ ہے عظمت مصطفیٰ ﷺ کے سفر کی داستان جس کے چند خدوخال میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں۔

عظمت مصطفیٰ ﷺ کا ظہور کامل۔ کب اور کیسے؟

اب آخری نکتہ جو مجھے عرض کرنا ہے وہ یہ کہ حضور ﷺ کی اس عظمت کا آخری اور کامل ظہور ابھی باقی ہے۔ قرآن مجید میں تین جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ:۳۳'الفتح:۲۸'الصف:۹)

''وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (یعنی قرآن حکیم) اور دین حق دے کر تاکہ غالب کرے اس (دین حق) کو پورے کے پورے نظامِ زندگی پر۔''

اس موضوع پر میری کتاب ''نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت'' میں اس آیتِ مبارکہ پر ۲۴ صفحات پر مشتمل مقالہ شامل ہے۔ مذکورہ بالا آیت کی رو سے بعثتِ محمدیؐ کا مقصد غلبہ دین ہے' جبکہ بعثتِ محمدیؐ تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف الفاظ میں پانچ مرتبہ آیا ہے' لیکن اس ضمن میں اہم ترین آیت یہ ہے کہ:

﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا﴾ (سبا:۲۸)

"ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو (اے محمدؐ) مگر پوری نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر۔"

اس صغریٰ کبریٰ کو جوڑ لیجیے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعثت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مقصد بتمام و کمال صرف اُسی وقت پورا ہوگا جب کہ کل روئے ارضی پر اور پورے عالم انسانیت پر اللہ کا دین غالب ہوگا۔ ورنہ ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

احادیث نبویؐ میں قیامت سے قبل عالمی غلبہ اسلام کی صریح پیشین گوئی موجود ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ قیامت سے قبل کل روئے ارضی پر نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہو گا۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ دور لازماً آئے گا اور اُس وقت اصل میں رسول اللہؐ کی بعثت کا مقصد بتمام وکمال پورا ہوگا۔ آج سے چودہ سو سال پہلے خلافت راشدہ کے دور میں اسلامی افواج نے جس طرح تین اطراف میں پیش قدمی کی تھی اس وقت اسلام کا عالمی غلبہ زیادہ دور نظر نہیں آ رہا تھا۔ شمال کی طرف جانے والی افواج نے ایشیائے کوچک میں جا کر دم لیا تھا اور مشرق اور مغرب میں اس تیزی سے فتوحات ہو رہی تھیں کہ ع "رکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا!" کوئی طاقت ایسی نہیں تھی جو اس سیل رواں کو روک سکے' لیکن اُس وقت اسلامی انقلاب کو اندرونی طور پر سبوتاژ کیا گیا۔ عبداللہ بن سباء نامی ایک یہودی نے اسلام کا لبادہ اوڑھا اور اندرونی طور پر انتشار و خلفشار پیدا کر کے مسلمان کو مسلمان سے لڑا دیا۔ اسی خلفشار کے نتیجے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا اور اس کے بعد چار برس تک مسلمانوں میں خانہ جنگی ہوتی رہی جس میں ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں اور نیزوں سے قتل ہو گئے۔ اسلامی فتوحات کا سلسلہ نہ صرف رک گیا بلکہ رجعت قہقہری کا شکار ہو گیا۔ لیکن اسلام کے عالمی غلبے کا یہ کام ہونا ہے جس کی خبر محمد رسول اللہ ﷺ نے دی تھی۔ اور قرائن بتا رہے ہیں کہ وہ وقت اب دُور نہیں ہے۔ ہمارے شاعر مشرق حکیم الامت علامہ اقبال جو بڑے دور اندیش (Visionary) تھے' جن کا اپنا دعویٰ ہے کہ ع "گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود" انہوں نے دل وجود کو چیر کر دیکھ لینے والی نگاہ سے مستقبل کے پردوں کو چیر کر دیکھا ہے کہ کیا کچھ ہونے والا ہے۔ کیا کیف ہوگا جبکہ جامع مسجد قرطبہ کے باہر بہنے والے دریا کے کنارے علامہ نے اپنا یہ وجدان پیش کیا ؎

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب!

علامہ اقبال مزید فرماتے ہیں ؎

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی!
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!!

پس یہ دور تو آ کر رہے گا' لیکن یاد رکھیے کہ یہ اب بھی اسی طرح آئے گا جیسے ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ﴾ کی محنت اور قربانیوں سے آیا تھا۔ وہ لوگ سراسر محروم رہ گئے جو اُس دور میں موجود تھے اور پھر بھی انہوں نے اس جدوجہد میں حصہ نہ لیا۔ وہ کفر کے دامن سے وابستہ رہے یا انہوں نے نفاق کا لبادہ اوڑھ لیا۔ وہ لوگ انتہائی بدبخت اور محروم تھے جنہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کا دورِ سعادت پایا لیکن آپؐ کے دست و بازو نہ بنے۔ ان کے لیے روحانی ترفع' مقاماتِ بلند اور جنت کے اعلیٰ درجات حاصل کرنے کے کس قدر مواقع تھے' لیکن وہ لوگ محروم رہ گئے۔ اور جنہوں نے: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ﴾ والی روش اختیار کی وہ کامیاب ہو گئے۔ (ترجمہ آیت: "اللہ کے رسول محمد ﷺ اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں کفار پر بہت سخت اور آپس میں رحیم ہیں"۔ اور جنہوں نے کامیاب تجارت کا راستہ اختیار کیا وہ

سرخرو ہو گئے' جس کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا هَلۡ اَدُلُّكُمۡ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنۡجِيۡكُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۝۱۰ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُجَاهِدُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ ۝۱۱﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میں تمہاری راہنمائی کروں ایسی تجارت کی طرف جو تمہیں دردناک عذاب سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے''۔

یہ سورۂ مبارکہ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡۤا اَنۡصَارَ اللّٰهِ﴾ ''اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو!''

اس کے بعد الفاظ آتے ہیں:

﴿مَنۡ اَنۡصَارِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ ''کون ہیں میرے مددگار اللہ کے راستے میں؟''

تو جان لیجیے کہ اسلام کا عالمی انقلاب پکار رہا ہے اور ''مَنۡ اَنۡصَارِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ'' کی آواز ہم اپنے روحانی کانوں سے سن سکتے ہیں۔ علامہ اقبال نے حق و باطل کی آویزش کے بارے میں کہا تھا ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی!

حق و باطل کی جنگ ختم نہیں ہوئی' بلکہ ایک نئی شان اور ایک نئی ہیبت کے ساتھ آنے والی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش　　تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا!

اللہ کو پامردئ مومن پہ بھروسہ　　ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا!

قرآن کے الفاظ میں ''بَاۡسٌ شَدِيۡدٌ'' اور حدیث نبویؐ کے الفاظ میں ''اَلۡمَلۡحَمَةُ الۡعُظۡمٰى'' عنقریب آنے والی ہے۔ یہ زیادہ دور نہیں ہے۔ اس معرکۂ حق و باطل کے لیے ''كُوۡنُوۡۤا اَنۡصَارَ اللّٰهِ'' کی پکار سنائی دے رہی ہے۔ غزوۂ حنین میں رسول اللہ ﷺ نے پکارا تھا:

((اِلَيَّ يَا عبادَ اللّٰهِ! اِلَيَّ يَا اَصۡحَابَ البدر! اِلَيَّ يا اصحابَ الشجرة))

''میری طرف آؤ اور اللہ کے بندو! کہاں جانے والے ہو؟ اے بدر میں ساتھ دینے والو اور حدیبیہ میں بیعت علی الموت کرنے والو! میری طرف آؤ!!''(۱)

آج بھی یہ پکار بالفعل موجود ہے۔ کون ہے کہ جو اس پکار پر لبیک کہے؟ جو اپنا تن من دھن اس کے لیے وقف کرنے کو تیار ہو؟ یہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہمارا عملی تعلق۔ یہ حب رسولؐ کا تقاضا ہے۔ عید میلاد کی محفلیں اور جلوس نکالنا حب رسولؐ کا تقاضا نہیں ہے۔ حب رسولؐ کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کے مشن کی تکمیل کے لیے تن من دھن ایک کر دیا جائے۔ حب رسولؐ کے تقاضے کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سمجھا تھا جنہوں نے اپنا سب کچھ نثار کر دیا۔ ایک وقت میں گھر میں جھاڑو پھیر کر سارا مال حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا' اور جب ان سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا تھا کہ گھر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا نام چھوڑ آیا ہوں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرنے والے تو وہ تھے۔ محفلیں منعقد کر لینا' کھڑے ہو کر سلام پڑھ لینا یا جلوس نکال لینا حب رسول نہیں ہے! حب رسول تو یہ ہے کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کی جدوجہد میں جان' مال اور وقت کھپا دیا جائے۔ اس ضمن آپ میرے دو کتابچے ''حب رسولؐ اور اس کے تقاضے'' اور ''نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں'' کا مطالعہ کیجیے' ان میں ایک پورا پیغامِ عمل اور دعوتِ عمل موجود ہے۔ اسلام کا عالمی غلبہ اور نظامِ خلافت کا قیام ایک شدنی امر اور ایک اٹل حقیقت ہے' اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ ہاں فرق صرف اس میں واقع ہوگا کہ کون درجاتِ عالیہ کے حصول کے سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کون اپنے آپ کو محرومین کی فہرست میں رکھتا ہے' اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق دے کہ ہم اس کشاکش خیر وشر اور روح و بدن کے درمیان جو معرکہ درپیش ہے' اس کا پھر ایک climax جو آنے والا ہے' اس میں حق کے سپاہی اور اللہ کے دین کے خادم بن کر قرآن حکیم کے ان الفاظ کی عملی تصویر بن جائیں:

﴿اِنَّ صَلَاتِىۡ وَنُسُكِىۡ وَمَحۡيَاىَ وَمَمَاتِىۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾

''بے شک میری نماز' میری قربانی' میرا جینا اور میرا مرنا اس کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے''۔

اس کے لیے عزمِ مصمم اور فیصلہ کریں کہ ہمیں اسی جدوجہد میں اپنے آپ کو ہمہ تن جھونک دینا ہے۔

اَقُوۡلُ قَوۡلِىۡ هٰذَا وَاسۡتَغۡفِرُ اللّٰهَ لِىۡ وَلَكُمۡ وَلِسَائِرِ الۡمُسۡلِمِيۡنَ وَالۡمُسۡلِمَاتِ

☆-☆-☆

---

(۱) مسند احمد' ح ۱۳۵۶۳ (الفاظ مختلف ہیں)

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ - اور - غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**